برگ نوخیز ۔ از عزیز تمنائی، صفحات ۱۱۰، ٹائپ عمدہ: ناشر دار التصنیف، مدراس ۱۴ ۔

یورپین شاعری میں جو اصناف قبول عام حاصل کرچکی ہیں ان میں ایک سانیٹ بھی ہے، جس کا رواج پندرھویں صدی میں فرانس اور انگلستان میں ہوا، یہ چودہ مصرعوں کی ایک نظم ہوتی ہے، جو دو بندوں میں تقسیم ہوتی ہے، جس میں کوئی جذبہ ایک مسلسل خیال کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے، اردو میں ن۔ م راشد، اختر شیرانی اور بعض دوسرے شعراء نے اس صنف میں کچھ نظمیں لکھی ہیں، مگر عزیز تمنائی نے اس صنف کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے، اور اردو زبان میں غالباً اس صنف میں یہ پہلا مجموعہ ہے جسے انھوں نے پیش کیا ہے۔

عزیز تمنائی کو شاعری پر پوری قدرت بھی ہے، اور "جذب دل" سے ان کا سینہ خالی نہیں ہے، اس لیے ان کے کلام میں روانی و برجستگی کے ساتھ تاثیر و معنویت نمایاں ہے، امید کہ ان کی یہ کوشش قبول عام حاصل کرے گی، اور اردو شعراء کو اس سے شاعری کا ایک نیا میدان ہاتھ آئے گا۔

خیالات ۔ مرتبہ مولوی محمد یونس صاحب نگرامی، تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۸، قیمت ۱۲؍

مولوی محمد یونس صاحب نگرامی ندوی نے ملک کے آٹھ ممتاز اصحاب علم و نظم مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا عبد الباری ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا ابو الحسن علی ندوی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا حکیم محمد اسحاق سندیلوی سے مختلف اوقات میں انٹرویو لیے تھے، یہ کتابچہ اسی کا مجموعہ ہے، جو مختلف مسائل کے متعلق ان اکابر کے خیالات اور بہت سے علمی و ادبی، تعلیمی، دینی، اخلاقی اور سیاسی معلومات و فوائد پر مشتمل ہے، جن کے پڑھنے سے بصیرت حاصل ہوتی ہے، انداز بیان بھی دلچسپ ہے۔

"م۔ ج"

جلد ۹۶ ۔ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۵ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۶۵ء عدد ۳

مضامین

شذرات

رن کچھ کے معاہدے کے بعد امید بندھی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوسرے مسائل میں بھی مفاہمت کی راہ ہموار ہو جائیگی لیکن کشمیر میں پاکستان کی مسلح مداخلت نے ہندوستان کو مدافعت پر مجبور کر دیا، اس کا لازمی نتیجہ جنگ تھی جس وقت یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں، دونوں میں گھمسان کی لڑائی برپا ہے، اس وقت سب سے زیادہ نازک پوزیشن ہندوستان کے مسلمانوں کی ہے، ان سے اکثریت کی بدگمانی دور نہیں ہوتی، فرقہ پرور جماعتیں تو ان کو علانیہ پاکستان کا ایجنٹ کہتی ہیں، اور جب ہندوستان اور پاکستان میں کوئی آویزش ہوتی ہے تو اس کا نزلہ مسلمانوں پر گرتا ہے، اس جنگ میں بھی اس کا اندیشہ ہے، اس لیے اس بارہ میں تھوڑی سی وضاحت کی ضرورت ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو پاکستان سے جذباتی لگاؤ ہے، اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ کوئی بیگانہ اور اجنبی ملک نہیں بلکہ ہندوستان ہی کا کٹا ہوا حصہ ہے، ان دونوں حصوں کے درمیان ہر قسم کے وہ تعلقات قائم ہو چکے ہیں جو ایک ملک کے باشندوں میں ہوتے ہیں، یہ تعلقات محض سیاسی تقسیم سے دفعۃً دور نہیں ہو سکتے، خاص طور سے ہندوستان کے مسلمانوں کا کوئی گھر ایسا نہیں ہے جس کے افراد ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم نہ ہوں، وہ ایک دوسرے سے کیسے بے تعلق ہو سکتے ہیں، یہ تعلق بالکل فطری ہے، یہی حالت مشرقی پاکستان اور مغربی بنگال کے ہندوؤں کی بھی ہے، جو دو ایک پشتوں تک قائم رہے گی اور موجودہ نسلوں کے ختم ہونے کے بعد جا کر ختم ہوگی، اور پھر ہندوستان کے مسلمانوں کو پاکستان سے اسی قدر تعلق رہ جائیگا جو دوسرے اسلامی ملکوں سے ہے۔

لیکن اس جذباتی لگاؤ کو پاکستان سے مسلمانوں کے دلی تعلق اور ہندوستان سے انکی بے تعلقی پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے، اسکے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ جب ہندوستان اور پاکستان کے مقابلہ کا سوال آ جائیگا اس وقت بھی وہ ہندوستان پر پاکستان کو ترجیح دینگے، پاکستان سے ان کو صرف جذباتی لگاؤ ہے اور ہندوستان تو ان کا وطن ہے، ان کو یہیں جینا اور مرنا ہے، انکا سارا نفع و نقصان اسی سے وابستہ ہے، اسلیے وہ ہندوستان سے کس طرح بے تعلق ہو سکتے ہیں اور اس پر پاکستان کو کیسے ترجیح دے سکتے ہیں، ہندوستان سے متعلق ان کے وہی حقوق و فرائض ہیں جو ہندوستان کے ہر شہری کے ہیں، اور پھر ہندوستان اور پاکستان کی جنگ ہندو مسلمانوں کی جنگ نہیں بلکہ دو ملکوں کی سیاسی لڑائی ہے، اور دونوں ملکوں میں ہندو و مسلمان دونوں رہتے ہیں، اور ان دونوں کا یہ فرض ہے کہ ایسے حالات میں اپنے ملکوں کا ساتھ دیں، اسلیے ہندوستان کے کچھ کروڑ مسلمان بھی پوری طرح حکومت کے ساتھ ہیں، وطن کی مدافعت میں ان کا قدم کسی سے پیچھے نہیں رہے گا اور ان کو کسی قربانی سے بھی دریغ نہ ہوگا، خود واقعات اس کو ثابت کر دیں گے۔

اس وقت کسی طرح قومی اتحاد اور یکجہتی کی اہمیت فوج اور اسلحہ سے کم نہیں ہے، کسی قسم کا انتشار بھی ملک کے لیے سخت مضر ہوگا، اس لیے ایسی تمام چیزوں سے بچنے کی ضرورت ہے جو اس میں رخنہ ڈالنے والی ہیں، تاکہ ہندوستان کے کل باشندے یک دل ہو کر متحدہ قوت سے مقابلہ کر سکیں، لیکن جنگ ایسی چیز ہے جس کی تباہ کاریوں سے کوئی فریق بھی محفوظ نہیں رہ سکتا، اس لیے اس کی دعا کرنی چاہیے کہ دونوں میں مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے تاکہ دونوں ملک تباہی سے بچ جائیں، اقوام متحدہ اور ایشیا و افریقہ کے ملکوں کو ملکر اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ ہندوستان اور پاکستان چین اور مغربی قوموں کا میدانِ جنگ نہ بننے پائیں، ورنہ دونوں تباہ ہو کر رہ جائیں گے۔

ہم نے گذشتہ مہینہ ایک معتبر راوی کی اطلاع پر لکھا تھا کہ ادارۂ آئینۂ ادب انارکلی لاہور نے سیرۃ النبیؐ کا پورا سٹ چھاپ لیا ہے، اب اس ادارے کے مالک عبد السلام صاحب کا خط ہمارے پاس آیا ہے کہ "یہ اطلاع سراسر غلط ہے جن صاحب نے یہ اطلاع دی ہے ممکن ہے ان کو اس لیے غلط فہمی ہوئی کیونکہ ہم نے دار المصنفین کی مطبوعہ سیرت کی عمدہ جلد بندھوا کر اور گرد پوش لگا دیا ہے، آئینۂ ادب ایسا ادارہ نہیں ہے جو اس قسم کی حرکتیں کرتا ہو۔"

ہمارے پاس جو اطلاع آئی تھی وہ اس قدر واضح تھی کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی، ہم نے اس خط کا ضروری حصہ بھی معارف میں شائع کر دیا تھا، اور اصل خط ہمارے پاس محفوظ ہے، پھر یہ اطلاع ایک ثقہ اہل قلم نے دی تھی، جو کئی کتابوں کے مصنف اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے سوانح نگار اور غالباً ان کے متوسلین میں بھی ہیں، اس لیے ان کی اطلاع پر یقین کر کے ہم نے معارف میں اس کا ذکر کر دیا، اتنی فروگذاشت ضرور ہوئی کہ براہ راست آئینہ ادب والوں سے اسکی تحقیقات نہیں کی، اب اس کی تردید کے بعد ہم کو پورا یقین ہے کہ یہ اطلاع کسی غلط فہمی ہی کا نتیجہ تھی، لیکن گل رعنا اور شعر الہند کی اشاعت کی جن کو ایک دوسرے ادارے نے شائع کیا ہے، ابھی تک تردید نہیں ہوئی ہے ہم اس کی تحقیقات کر رہے ہیں۔

مقالات

مسند امام احمد بن حنبل

اور

اُس کی خصوصیات

از جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین

امام احمدؒ کی شخصیت بڑی جامع اور وہ مجموعۂ کمالات تھے لیکن ان کی شہرت ایک محدث اور صاحب مذہب امام فقہ کی حیثیت سے زیادہ ہے، اور گو متاخرین ان کو ایک صاحب مذہب اور امام فقہ کی حیثیت سے زیادہ جانتے ہیں لیکن متقدمین میں وہ محدث ہی کی حیثیت سے زیادہ معروف تھے، چنانچہ بعض قدماء نے ان کو صاحب مذہب ائمہ اور فقہاء میں شمار بھی نہیں کیا ہے، اس پر آئندہ چل کر بحث کیجائیگی۔ یہاں یہ دکھانا مقصود ہے کہ قدیم اور اس کے بعد کے دور میں امام صاحب ایک عظیم اور جلیل القدر امام حدیث کی حیثیت سے مشہور رہے ہیں، اور متقدمین کے نزدیک وہ اسی خصوصیت کے لحاظ سے زیادہ ممتاز تھے، اس کی وجہ محبت رسول اور اتباع سنت کے علاوہ احادیث سے ان کا غیر معمولی اشتغال و انہاک اور مسند جیسی لازوال اور بے نظیر کتاب کی ترتیب و تصنیف ہے اس لیے ذیل میں اس شہرۂ آفاق کتاب کا تعارف اور اس کی خصوصیات وغیرہ پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

مسند احمد اور دوسرے مسانید | امام احمدؒ کی تصنیف سے پہلے بھی اس موضوع پر تالیف و تصنیف کا کام

شروع ہو چکا تھا۔ ائمۂ اربعہ میں امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے مسانید موجود ہیں، لیکن انکی تالیف و ترتیب خود ان بزرگوں نے نہیں کی تھی[1]، اور نہ ان کو مسند احمد کے جیسی شہرت نصیب ہوئی، کیونکہ استقصاء، جامعیت اور استناد ہر لحاظ سے ان کا پایہ اس سے کمتر ہے، دوسرے علماء میں ابوداؤد طیالسی اور بعض دوسرے ائمۂ محدثین کے مسانید بھی مشہور اور اپنے اپنے رنگ میں خوب ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ علم حدیث کی تاریخ میں جو مسانید کے مجموعے مرتب کیے گئے ہیں، ان میں سے کسی کو بھی مسند احمد کی طرح شہرت و اعتبار حاصل نہ ہو سکا، خالص فنی اور تصنیفی لحاظ سے بھی ان میں سے کسی مسند کو امام صاحب کے مسند کے مقابلہ میں نہیں لایا جا سکتا، اس لیے عام مسانید سے اس کے مقابلہ و محاکمہ کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا،

مسند کی تعریف اور تالیف و ترتیب مسانید کا طریقہ

مسند اُس حدیث کو کہتے ہیں جس کی اسناد اول سے آخر راوی تک متصل ہوں، لیکن اس کا استعمال عموماً ان ہی حدیثوں پر ہوتا ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہوں، صحابہ کرام کی مرویات پر جنکی سند رسول اللہؐ تک نہ پہنچی ہو، اس کا اطلاق نہیں ہوتا، حافظ ابن عبد البر نے اس کی تصریح کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس قسم کی روایت متصل بھی ہو سکتی ہے اور منقطع بھی، جیسے امام مالک نے زہری سے اور وہ عبد اللہ بن عباسؓ کے واسطے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیثیں بیان کی ہیں وہ منقطع ہونے کے باوجود بھی مسند ہیں، اس لیے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک ان کا سلسلہ روایت پہنچ جاتا ہے، لیکن چونکہ زہری کا عبد اللہ بن عباسؓ سے سماع ثابت نہیں ہے اس لیے وہ منقطع ہیں،

حافظ ابن عبد البر نے محدثین کی ایک جماعت کا یہ خیال بھی نقل کیا ہے کہ مسند وہی احادیث کہلاتی ہیں جن کی سند میں کوئی انقطاع نہ ہو اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متصل و مرفوع طریقہ پر ثابت ہوں[2]۔

---

[1] بستان المحدثین ص ۲۰ [2] مقدمہ ابن صلاح ص ۲۱ بحوالہ الخطیب بغدادی

کتب حدیث کی قسموں میں ایک قسم مسانید بھی ہے، یہ ان کتابوں کو کہتے ہیں جن میں صحابہ کی ترتیب پر حدیثیں مرتب کی جاتی ہیں، یہ ترتیب یا تو حروف تہجی کے اعتبار سے ہوتی ہے یا سبقت فی الاسلام کے اعتبار سے اور کبھی شرافتِ نسب کے لحاظ سے بھی ہوتی ہے،

حروف تہجی کے لحاظ سے اگر حدیثیں مرتب کیجائیں گی تو حضرت ابو بکرؓ کی حدیثیں پہلے، پھر حضرت اسامہؓ اور انسؓ وغیرہ کی، اور اگر سبقت اسلام کا لحاظ کیا جائے گا تو عشرۂ مبشرہ کی حدیثیں پہلے، پھر شرکائے بدر، اہل حدیبیہ اور فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والے صحابہؓ کی احادیث ہوں گی، پھر صحابیات کی روایتیں، ان میں ازواج مطہرات کی روایتیں سب پر مقدم ہوں گی، اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں سے مروی حدیثیں ہوں گی،

اگر قبائل و انساب کے لحاظ سے ترتیب ہو گی تو سب سے پہلے بنی ہاشم کے مسانید خصوصاً امام حسینؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ کی روایتیں ہوں گی، اس کے بعد ان قبائل کے راویوں کی حدیثیں ہوں گی جن کو نسب کے اعتبار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قرب ہوگا، اس صورت میں حضرت عثمانؓ کی روایتیں حضرت ابو بکرؓ کی روایتوں سے پہلے لکھی جائیں گی اور حضرت ابو بکرؓ کی حضرت عمرؓ کی حدیثوں پر مقدم ہوں گی[1]۔

کتب حدیث کی تدوین میں ایک طریقہ تو ابواب کی ترتیب پر ہوتا ہے، یعنی ہر باب کے تحت اس سے متعلق احادیث ذکر کیجاتی ہیں، اور دوسرا مسانید پر جس کی تفصیل اوپر بیان کیگئی، لیکن کبھی کبھی فقہی ابواب پر مرتب کتابوں کو بھی مسند کہا جاتا ہے، بشرطیکہ ان کی ترتیب حروف کلمات پر ہو، اور اس میں ہر حدیث کی سند آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم تک مذکور ہو، اس لیے کہ وہ مسند اور مرفوع حدیثوں کا مجموعہ ہوتی ہیں، اسی لیے امام بخاری نے اپنی کتاب کا نام

---

[1] مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۳۵ بحوالہ عجالۂ نافعہ

"الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول اللہ وسننہ و ایامہ"، اور امام مسلم نے بھی اپنی صحیح کو اسی اعتبار سے مسند کہا ہے، اور سنن دارمی کو بھی مسند دارمی کہا جاتا ہے[1]۔

امام احمدؒ کا طریقہ امام احمد نے اپنی کتاب کو ابواب کے بجائے مسانید پر مرتب کیا ہے، لیکن تالیفِ مسانید کے جو عام قاعدے بیان کیے گئے ہیں، ان میں سے کسی قاعدہ کا بھی مسند احمد کے موجودہ متداول نسخہ میں مکمل طور پر لحاظ نہیں کیا گیا ہے، اس کا اندازہ سطور ذیل سے ہو جائیگا۔

تعداد و ترتیب مسانید حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے مسند احمد میں اٹھارہ مسانید بتائے ہیں، لیکن پیش نظر نسخہ میں ان کی تعداد ۲۹ ہے، جن کی تفصیل یہ ہے:

(۱) مسند ابوبکرؓ (۲) مسند عمرؓ بن خطاب (۳) مسند عثمانؓ (۴) مسند علیؓ (۵) مسند طلحہؓ بن عبد اللہ (۶) مسند زبیرؓ بن العوام (۷) مسند سعدؓ بن ابی وقاص (۸) مسند سعیدؓ بن زید[2] (۹) مسند اہل بیت[3] (۱۰) مسند بنی ہاشم[4] (۱۱) مسند عبد اللہ بن عباسؓ (۱۲) مسند عبد اللہ بن مسعودؓ (۱۳) مسند عبد اللہ بن عمرؓ (۱۴) مسند عبد اللہ بن عمرو بن عاصؓ[5] (۱۵) مسند ابی ہریرۃؓ (۱۶) مسند ابی سعید خدریؓ (۱۷) مسند انس بن مالکؓ (۱۸) مسند جابر بن عبد اللہ انصاریؓ (۱۹) مسند مکیین (۲۰) مسند صفوان

[1] فوائد جامعہ بر عجالۂ نافعہ ص ۱۵۸ و ۱۵۹ [2] اس کے بعد بلا عنوان مسند عشرہ مبشرہ میں حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ اور حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ اور پھر عبد الرحمن بن ابی بکرؓ، زید بن خارجہؓ، حارث بن خزمہؓ اور سعد مولی ابوبکرؓ کی حدیثیں ہیں، حضرت شاہ عبد العزیز صاحب نے ان سب کو صرف ایک مسند شمار کیا ہے اور اس کا عنوان مسند عشرہ مبشرہ و ما معہ رکھا ہے (البستان المحدثین ص ۲۵) [3] حسنینؓ، عقیلؓ، جعفر (پسران ابو طالب) اور عبد اللہ بن جعفر (نبیرہ ابو طالب) کی حدیثوں پر مشتمل ہے [4] حضرت عباسؓ اور انکی اولاد کبار فضل، تمام اور عبید اللہ کی حدیثوں پر مشتمل ہے، اسی لیے شاہ صاحب نے اسکا عنوان مسند حضرت عباسؓ و پسران بزرگوار ایشان تجویز کیا ہے (بستان ص ۲۵) [5] شاہ عبد العزیز صاحب نے ابن مسعودؓ، ابن عمرؓ اور عبد اللہ بن عمرو بن عاصؓ کے مسانید کو حضرت عباسؓ اور عبد اللہ بن عباسؓ کے مسانید سے پہلے نقل کیا ہے، مسند عبد اللہ بن عمروؓ کے ساتھ ہی ابو رمثہ کی حدیثیں بھی ہیں۔

(۲۱) مسند حکیم بن حزامؓ[1] (۲۲) مسند مدنیین (۲۳) مسند شامیین (۲۴) مسند کوفیین[2] (۲۵) مسند بصریین[3] (۲۶) مسند انصار (۲۷) مسند فضالہ[4] (۲۸) مسند عائشہؓ[5] (۲۹) مسند القبائل[6]۔

ان عنوانات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں تو سبقت و تقدم اسلام کا لحاظ رکھا گیا ہے، لیکن پھر اس اصول کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، اور کہیں حسب و نسب کی، کہیں ملک و قبیلہ کی رعایت کی گئی ہے، اور کہیں ان میں سے کسی چیز کا بھی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، اگر کوشش کی گئی ہوتی تو تعداد مسانید میں بھی اختصار سے کام لیا جا سکتا تھا،

مسانید کے قواعد سے انحراف کے باوجود چونکہ اس میں مسند کی اصل خصوصیت پائی جاتی ہے، یعنی ہر ہر صحابی کی حدیثیں الگ الگ لکھی گئی ہیں، اس لیے اس کا شمار بھی انہی میں کیا جاتا ہے، لیکن اس اصول کی بھی پوری پابندی مسند میں نہیں ہے، مثلاً مسند ابوبکرؓ میں ایک روایت عبد اللہ بن عباسؓ سے کی گئی ہے، جس کا حضرت ابوبکرؓ سے کوئی تعلق نہیں[7]۔ مسند عمرؓ کے بعد حدیث السقیفہ کے عنوان سے آٹھ روایتیں نقل کی گئی ہیں، جن میں صرف ایک ہی طویل روایت کا اس سے تعلق ہے، اور چھ روایتیں جو حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ کے واسطہ سے نقل کی گئی ہیں، ان کا نہ تو حضرت عمرؓ سے کوئی تعلق ہے اور نہ واقعہ سقیفہ سے بلکہ وہ سب بیوع سے متعلق ہیں[8]، مسند عثمانؓ میں بھی دو روایتیں اس طرح کی ہیں

[1] صفوان بن امیہ اور حکیم بن حزام دونوں مکی ہیں، اس لیے پھر مسند کے عنوان کی ضرورت نہ تھی، شاہ صاحب نے صرف مسند مکیین کا ذکر کیا ہے [2] مسند کوفیین کا دو جگہ عنوان قائم کیا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے، شاہ صاحب نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا [3] شاہ صاحب نے مسند کوفیین و بصریین کے بعد اہل شام کے مسند کا ذکر کیا ہے [4] حضرت فضالہؓ بھی انصاری تھے، اس لیے ان کی حدیثوں کو بھی بلا عنوان مسند، اور مسند انصار کے ساتھ ذکر کر دینا چاہیے تھا [5] اسی میں دیگر ازواج و بنات کے مسانید بھی نقل کر دینا مناسب تھا، دوسری صحابیات کی حدیثوں کو اس میں خلط ملط کرنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا [6] مسند قبائل کے بیچ میں بھی صحابیات کی روایتیں نقل کی گئی ہیں جو ٹھیک نہیں ہے [7] مسند جلد ۱ ص ۸ [8] ایضاً ص ۵۶

جن کا ان سے کوئی تعلق نہیں[1]، مسند عبد اللہ بن مسعودؓ میں بھی ایک روایت اسی طرح کی پائی جاتی ہے[2]، اور مسند عبد اللہ بن عمرو بن عاصؓ میں کئی غیر متعلق روایتیں عمرو بن شعیب عن جدہٖ کے واسطہ سے[3] اور ایک روایت اعشیٰ شاعر کی بھی ہے۔[4]

بعض جگہوں میں محض معمولی اور ادنیٰ مناسبت کی بنا پر غیر متعلق روایتیں لائی گئی ہیں، مثلاً حدیث البصریین میں انس بن مالکؓ کی ایک روایت جو انصار کے فضائل میں ہے[5]، مسند ابن عباسؓ[6]، مسند ابن مسعودؓ[7] اور ابن عمرؓ[8] میں بھی اس طرح کی احادیث ملتی ہیں۔

ترتیب و تقسیم کی بعض فروگذاشتوں کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، مثلاً مسند کوفیین کا دو جگہ عنوان یا مسند النساء کو مسند عائشہ اور مسند القبائل میں خلط ملط کر دینا، حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ نے بھی ترتیب کی ان خامیوں کا ذکر کیا ہے:

"و امام احمد ایں کتاب بطریق بیاض جمع میکرد و ترتیب و تہذیب او از اں امام بوقوع نیامد بلکہ بعد از وے پسر او عبد اللہ بترتیب آں پرداختہ لیکن در آنجا خطاہائے بسیار کردہ مدنیاں را در شامیاں درج کردہ و بالعکس۔"[9]

مسند کے عنوانات اکثر تو ناموں کے ساتھ ہیں لیکن بعض جگہ اس قسم کے مبہم عنوان بھی ہیں:

حدیث رجل من اصحاب النبیؐ، حدیث رجال من اصحاب النبیؐ، حدیث بعض اصحاب النبیؐ، حدیث ثلاثین من اصحاب النبیؐ، حدیث رجل سمع النبیؐ، حدیث رجل رأی النبیؐ، حدیث من شہد النبیؐ، حدیث رجل ادرک النبیؐ، حدیث رجال من الانصار، حدیث رجل من اہل المدینہ وغیرہ۔

اسی طرح بعض صحابہ کی روایات متعدد جگہوں پر نقل کی گئی ہیں، ایسی ان حدیثوں میں تو کوئی حرج نہیں تھا جن کا تعلق کئی صحابیوں سے ہوتا ہے، لیکن ایک ہی صحابی کے مرویات کو دو مقام پر مختصر و مطول کر کے

---

[1] مسند ج ۱ ص ۲۰، ۳۰ [2] ایضاً ص ۳۸۴ [3] ایضاً ج ۲ ص ۱۹۵ و ۱۹۶ و ۲۰۳ و ۲۲۵ [4] ایضاً ص ۲۰۱ و ۲۰۲ [5] ایضاً ج ۱ ص ۷۵ [6] ایضاً ص ۲۹۲ [7] ایضاً ص ۳۸۴ و ۳۸۸ [8] ایضاً ص ۱۵۲ ج ۲ [9] بستان المحدثین ص ۲۶

ترتیب دینا بلا فائدہ تکرار ہے، مرتب نے اس طرح کے مواقع پر زیادۃ، بقیۃ اور تمام حدیث فلاں کے عنوان قائم کیے ہیں۔

لیکن جیسا کہ حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب نے مسند کو مسودہ کی صورت میں چھوڑا تھا اور اس کی ترتیب و تہذیب آپ کے صاحبزادہ نے کی ہے، اس لیے ان سے اس طرح کی غلطیوں کا ہو جانا بعید نہ تھا، کیونکہ وہ خود اصل جامع نہ تھے، ان خامیوں کی ذمہ داری امام صاحب پر عائد نہیں ہوتی۔

اس طریقۂ تصنیف کا فائدہ

مسند کے جس طریقۂ تصنیف کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس طریقۂ تصنیف کے مقابلہ میں دشوار اور دقت طلب معلوم ہوتا ہے جس میں ابواب کا لحاظ کیا جاتا ہے، کیونکہ اگر کسی شخص کو کسی حدیث کی تلاش ہو اور اسے صحابی کا نام معلوم نہ ہو تو پوری کتاب پڑھنی پڑے گی، اور اگر صحابی کا نام بھی معلوم ہو لیکن اس صحابی سے بہت زیادہ حدیثیں منقول ہوں جب بھی تلاش میں دقت اور دشواری ہوگی، اور اگر مجرد تلاش مقصود ہو اور کوئی چیز ذہن نشین نہ ہو تو استفادہ میں مزید دشواری ہے، لیکن قدیم زمانہ میں تصنیف کا یہ طریقہ رائج تھا، اور امام احمدؒ سے پہلے بھی اس طرح کے مسانید کے مجموعے پائے جاتے تھے، اس طریقۂ تالیف کا مقصد تدوین حدیث تھا، تاکہ حدیثوں کے الفاظ محفوظ ہو جائیں، اور ان سے استنباطِ احکام کیا جا سکے، قدیم زمانہ کے لحاظ سے یہ طریقہ اس لیے مفید تھا کہ اس وقت لوگوں کو حدیث سے بڑا اشتغال تھا، اور ان کو اکثر حدیثیں حفظ رہتی تھیں، بلکہ سور قرآن کی طرح وہ مسانید صحابہ کو بھی محفوظ اور ازبر کرتے تھے، اس لیے ان کے لیے اس میں کوئی دشواری اور دقت نہ ہوتی تھی بلکہ حافظہ کی قوت کو باقی رکھنے کے لیے یہی طریقہ بہتر سمجھا جاتا تھا، مگر اب جبکہ لوگوں کا اعتماد یادداشتوں اور کتابی ضبط و تحریر پر رہ گیا ہے، یہ طریقہ فرسودہ اور اس کی وجہ سے مسانید سے استفادہ بھی مشکل معلوم ہوتا ہے، اس لیے بعض علماء نے ابواب پر بھی اس کو مرتب کرنے کی کوشش کی تاکہ استفادہ

میں سہولت ہو، اس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی،

زوائد مسند اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ امام صاحب نے مسند کو مسودہ کی صورت میں چھوڑا تھا، بعد میں اس کو آپ کے صاحبزادے عبد اللہ نے مرتب بھی کیا اور اس میں کچھ اضافے بھی کیے،[1] اسی طرح ابوبکر قطیعی نے بھی اس میں بعض اضافے ہیں،[2] حافظ ابن تیمیہ نے تصریح کی ہے کہ مسند علی میں عبد اللہ کے اضافے بکثرت ہیں۔

امام صاحب نے مسند میں جس قدر احتیاط ملحوظ رکھی تھی اتنی احتیاط اضافوں میں نہیں کی جا سکی، اس لیے ان کا پایۂ اعتبار مسند سے کم ہو گیا ہے، حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ زوائد میں ضعیف اور موضوع روایات بھی شامل ہو گئی ہیں، جن کو ناواقف لوگ امام احمد ہی کی جانب منسوب کرتے ہیں،[3]

مسند کے مرویات کی قسمیں زوائد کے اعتبار سے مسند کی روایتوں کو چھ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے،

(۱) وہ روایتیں جن کو امام صاحب کے فرزند عبد اللہ آپ کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں، اور یہی اصل مسند احمد ہے، اس میں اس طرح کی روایتیں ۳/۴ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں،

(۲) وہ حدیثیں جن کو عبد اللہ نے آپ سے بھی اور آپ کے علاوہ دوسرے لوگوں سے سنکر روایت کیا ہے، اس طرح کی حدیثیں بہت کم ہیں۔

(۳) وہ حدیثیں جن کو عبد اللہ نے آپ کے علاوہ دوسرے شیوخ سے نقل کیا ہے، اسی قسم کی روایتوں کو زوائد عبد اللہ کہا جاتا ہے، ان کی تعداد پہلی قسم سے کم مگر اور قسموں سے زیادہ ہے۔

(۴) وہ حدیثیں جن کو عبد اللہ نے امام صاحب سے سنا تو نہیں ہے، لیکن ان کی آپکے سامنے قرأت کی تھی، اس قسم کی روایتیں بہت کم ہیں،

(۵) ایسی حدیثیں جن کو انھوں نے نہ امام صاحب سے سنا اور نہ آپ کے سامنے پڑھا بلکہ آپ کی

[1] بستان المحدثین ص ۲۹، احمد بن حنبل والمحنۃ ص ۴۲ و کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۱ [2] بستان المحدثین ص ۲۹
[3] منہاج السنۃ

کتاب یا کسی تحریر سے نقل کیا ہے، اس طرح کی روایتوں کی تعداد بھی کم ہے۔

۶- ابوبکر قطیعی کے زیادات جن کو انھوں نے عبد اللہ اور ان کے والد کے بجائے کسی اور سے بیان کیا ہے، اس طرح کی روایتیں بہت کم ہیں۔

مسند اور زوائد میں امتیاز جو روایتیں امام صاحب سے مروی ہوتی ہیں ان کی علامت یہ ہے: حدثنا عبد اللہ حدثنی ابی۔

اور زوائد عبد اللہ کی علامت :- حدثنا عبد اللہ حدثنا فلاں (اس میں ابی کا لفظ نہیں ہوتا)

قطیعی کے زوائد کی مثال :- حدثنا فلاں (یعنی عبد اللہ اور ان کے والد کے نام کے بغیر)

یہ ہے مسند احمد کے موجودہ متداول نسخہ کی ہیئت جس میں تقریباً سات سو صحابہ کی حدیثیں شامل ہیں[1] اور جن کی تعداد عام طور سے تیس اور چالیس ہزار بتائی جاتی ہے، لیکن ابن خلدون نے لکھا ہے کہ وہ پچاس ہزار ہیں[2]، مگر وہ اپنے قول میں منفرد ہیں، بقیہ دونوں اقوال میں حضرت شاہ عبد العزیز صاحب نے اس طرح تطبیق دی ہے کہ مسند کی اصل روایات تو تیس ہزار ہی ہیں، دس ہزار کے قریب زوائد عبد اللہ ہیں، دوسری صورت یہ ہے کہ مکررات کے ساتھ ۴۰ ہزار اور حذف مکررات کے بعد تیس ہزار حدیثیں رہ جاتی ہیں[3]۔

وقف مستنصریہ کے نسخہ کے مطابق مسند احمد بن حنبل ۲۴ جلدوں پر مشتمل ہے[4]، اور اس میں ۱۰۲ اجزا ہیں،[5] تجزیہ کنندہ کا نام ابو علی حسن بن علی المذہب (م ۴۴۲ھ) ہے جنھوں نے ابوبکر احمد ابن جعفر قطیعی سے مسند کی روایت کی ہے[6]، مسند کے قلمی نسخے یورپ، آستانہ اور خدیویہ مصر کے کتب خانوں میں موجود ہیں[7]۔ اور ۱۳۱۳ھ میں وہ مطبعہ میمنیہ مصر سے چھ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

[1] طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۰۲ [2] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۴۸ [3] بستان المحدثین ص ۳۰ [4] کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۱
[5] بستان المحدثین ص ۲۹ [6] ایضاً [7] تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ ج ۲ ص ۱۴۱

اس کے حاشیہ پر منتخب کنز العمال بھی ہے[1]، تمام جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد ۲۸۸۰ ہے۔

مسند کی تالیف میں احتیاط امام احمدؒ نے مسند کی ترتیب و تالیف میں غیر معمولی احتیاط اور جانفشانی سے کام لیا ہے، ان کا خود بیان ہے کہ انھوں نے اس کو ساڑھے سات لاکھ سے زائد حدیثوں سے منتخب و مرتب کیا تھا[2]، علماء کا بیان ہے کہ انھوں نے مسند کی تدوین میں صحیح احادیث کی تخریج اپنے اوپر لازم کر لی تھی[3]، ابو موسیٰ مدینی کا بیان ہے کہ امام صاحب نے مسند میں ان ہی لوگوں سے روایتیں نقل کی ہیں جن کی صداقت و دیانت مسلم تھی، ایسے راویوں کی روایتیں بیان کرنے میں پرہیز کیا ہے جن کی امانت و دیانت میں طعن کیا گیا ہے[4]۔

امام صاحب کا خود بیان ہے کہ میں نے اس کتاب کو لوگوں کے لیے امام و حجت بنایا ہے تاکہ اختلاف کے وقت وہ اس کی جانب رجوع کریں، اگر اس میں ان کو کوئی حدیث مل جائے تو ٹھیک ہے، ورنہ وہ کسی ایسی حدیث کو صحیح تسلیم نہ کریں جو اس میں موجود نہ ہو[5]۔

اسی احتیاط کی بنا پر امام صاحب مسند کے مسودہ میں ہمیشہ کاٹ چھانٹ اور حذف و ترمیم کرتے رہتے، اور متن و اسناد دونوں کے سلسلہ میں پوری احتیاط ملحوظ رکھتے تھے، حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ایک روایت (یہلک امتی ھذا الحی من قریش الخ) کے متعلق آپ کے صاحبزادے عبداللہ کا بیان ہے کہ میرے والد نے مرض الموت میں مجھ سے فرمایا کہ اس کو مجموعہ سے خارج کر دو کیونکہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول (اسمعوا و اطیعوا) کے خلاف ہے، حالانکہ یہ روایت ثقہ لوگوں سے مروی تھی، لیکن اس کا متن مشہور حدیثوں کے خلاف ہے، اس لیے آپ نے اس کو حذف کرنے کی ہدایت فرمائی[6]۔

---

۱ معجم المطبوعات ج ۱ ص ۹۱ و مسند احمد ج ۶ ص ۴۶۰ ۲ طبقات الشافعیہ سبکی ج ۱ ص ۲۰۲ و معجم المصنفین ج ۲ ص ۳۳۴ ۳ کشف الظنون ج ۲ ص ۱۳۴ و معجم المصنفین ص ۴۳۴ ۴ طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۰۲ ۵ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۰۴ و معجم المصنفین ج ۲ ص ۳۳۵ ۶ طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۰۲ و ۲۰۳

متن کی طرح اسناد میں بھی پوری احتیاط برتتے تھے، عبداللہ کا بیان ہے کہ میں نے ان سے عبدالعزیز بن ابان کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا کہ میں نے مسند میں ان سے کوئی حدیث نہیں لی ہے، کیونکہ وہ حدیث مواقیت کو بیان کیا کرتے تھے، اسی طرح حضرت جابر بن سمرہؓ کی ایک روایت (لأن یؤدب الرجل ولدہ او احدکم ولدہ خیر لہ من ان یتصدق کل یوم بنصف صاع) کے متعلق عبداللہ فرماتے ہیں کہ میرے والد نے اس کو مسند میں اس لیے نہیں نقل کیا کہ اس میں ایک راوی ناصح ہیں جو ضعیف الحدیث ہیں، لیکن نوادر میں انھوں نے اس کا مجھے املا کرایا تھا[2]، احتیاط ہی کی وجہ سے آخر میں انھوں نے عبدالرزاق سے بھی روایت کرنا ترک کر دیا تھا، عبداللہ آپ کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ: "ہم نے عبدالرزاق سے شروع دور کے علاوہ اور کبھی کوئی حدیث تحریر نہیں کی[3]۔" انہی کا بیان ہے کہ ۲۰۰ھ کے بعد جن لوگوں نے عبدالرزاق سے روایتیں سنیں ان کا سماع ضعیف ہے، میرے والد نے قدیم زمانہ میں ان سے حدیثیں سنی تھیں[4]۔"

ان کی احتیاط کا اس سے اندازہ ہوگا کہ باوجودیکہ آپ کو لاکھوں حدیثیں زبانی یاد تھیں لیکن وہ محض اپنی یادداشت سے کوئی حدیث بیان کرنا احتیاط کے خلاف سمجھتے تھے، علی بن مدینی کا بیان ہے کہ "ہمارے رفقاء اور اصحاب میں امام احمد سے بڑا کوئی حافظ نہ تھا، لیکن وہ کتاب سے حدیثیں بیان کیا کرتے تھے، ان کے اس طرز عمل میں ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے[5]، وہ ہم کو بھی تاکید کرتے تھے کہ جب حدیثیں بیان کریں تو کتاب کو پیش نظر رکھیں[6]۔"

ابراہیم بن خالد بیان کرتے ہیں کہ "ہم لوگ امام احمد کی مجلسوں میں حدیثوں پر بحث و مذاکرہ اور ان کو یاد کرتے لیکن جب ہم ان کو قلمبند کرنا چاہتے تو وہ جھپٹ کر کتاب لاتے اور فرماتے کہ کتاب

---

۱ طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۰۲ ۲ حاشیہ الفتح الربانی ج ۱ ص ۹ ۳، ۴ احمد والمحنۃ ص ۱۸ ۵ تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۲ ۶ شذرات الذہب ج ۲ ص ۹۰ و تہذیب الاسماء قسم اول جز ۱ ص ۱۱۱

بہترین یادداشت ہے۔[1]

کوئی ایسی روایت نہیں بیان کرتے تھے جو صرف ایک ہی سند سے مذکور ہوتی جب تک کہ اس کی نظیر نہ ملجاتی۔[2]

فضائل وغیرہ کی حدیثوں میں تھوڑی بہت نرمی گوارا بھی کرلیتے تھے، لیکن احکام، حدود اور کفارات وغیرہ میں ذرا بھی تساہل گوارا نہیں تھا، چنانچہ فرماتے ہیں کہ "فضائل اعمال اور ان کی ترغیب وجزاء وغیرہ سے متعلق اگر کوئی حدیث ہم کو معلوم ہوتی ہے تو اس میں زیادہ شدت نہیں اختیار کرتے لیکن حدود، کفارات اور فرائض وغیرہ سے متعلق روایتوں میں بڑی چھان بین اور پوری احتیاط اور سختی سے کام لیتے ہیں۔"[3]

مسند احمد کی اہمیت مسند کی ترتیب میں امام صاحب نے جس قدر احتیاط ملحوظ رکھی ہے وہ خود اس کی اہمیت کا بڑا ثبوت ہے، ذیل میں اس کی تفصیل نقل کیجاتی ہے۔

محدثین نے مسانید کا درجہ سنن سے کمتر قرار دیا ہے[4] لیکن مسند احمد کی حیثیت عام مسانید سے مختلف ہے، اسی لیے صحاح ستہ کے ساتھ ساتھ اس کا بھی نام لیا جاتا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے کتب حدیث کے درجے بیان کرتے ہوئے اس کو دوسرے درجہ کی کتابوں یعنی سنن ابی داؤد، جامع ترمذی اور مجتبی النسائی کے لگ بھگ قرار دیا ہے، اور تیسرے درجہ کی کتابوں سے جس میں عام جوامع ومسانید کو محسوب کیا ہے، اس کو اہم اور ممتاز قرار دیا ہے[5]، اس سے ظاہر ہے کہ مسند احمد اگر صحاح کی کتابوں کے برابر نہیں تو قریب قریب ان کے ہم پایہ ضرور ہے۔

دین وشریعت کو جاننے اور سمجھنے کے لیے امت نے جن کتابوں کو اہم اور بنیادی قرار دیا ہے

۱؎ تہذیب الاسماء، قسم اول جزء ۱ ص ۱۱۱ ۲؎ طبقات الشافعیہ شعرانی ص ۴۹ ۳؎ شذرات الذہب ج ۲ ص ۹۸

۴؎ التنقیح فی اصول الحدیث ص ۴ ۵؎ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۰۷

ان میں ایک یہ بھی ہے اور اس پر پوری ملت اسلامیہ کا ہمیشہ اعتماد و اعتبار رہا ہے، اور محدثین نے اس سے ہمیشہ اخذ واستناد کا کام لیا ہے، علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں:

هو اصل من اصول هذه الامة[1]	مسند احمد اس امت کی اصولی اور بنیادی کتابوں میں ہے۔

صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں:-

"وہ بڑی اہم اور منجملہ ان کتابوں میں ہے جو اسلام کی بنیادی کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔"[2]

اور ابوموسیٰ محمد بن ابوبکر مدینی کا بیان ہے:-

هذا الكتاب يعني مسند الامام	یہ کتاب یعنی مسند احمد ایک اہم اصل اور
ابي عبد الله احمد بن محمد بن حنبل	محدثین کے لیے قابل وثوق مرجع ہے، اس کو
الشيباني قدس الله روحه	انھوں نے بیشمار احادیث وروایات سے
اصل كبير ومرجع وثيق لاصحاب	رہنمائی اور اعتماد کے لیے منتخب ومرتب
الحديث انتقى من احاديث كثيرة	اور نزاع کی صورت میں استناد ورجوع
ومسموعات وافرة فجعل اماما	کا ذریعہ بنایا تھا۔
ومعتمدا وعند التنازع ملجأ	
ومستندا[3]	

آپ کے بھتیجے کا بیان ہے کہ "ہمارے چچا نے مجھکو صالح اور عبداللہ کو جمع کرکے مسند پڑھی، ہم لوگوں کے علاوہ کسی نے اس کتاب کو مکمل طور پر امام صاحب سے نہیں سنا، آپ نے فرمایا کہ میں نے سات لاکھ پچاس ہزار حدیثوں سے انتخاب کرکے اس کو جمع کیا ہے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جس حدیث کے بارہ میں مسلمانوں میں اختلاف ہو اس میں اس

۱؎ طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۰۱ ۲؎ کشف الظنون ج ۲ ص ۱۳۴۳ ۳؎ طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۰۱ و ۲۰۲

کتاب کی جانب رجوع کرو، اگر اس میں مل جائے تو ٹھیک ہے، ورنہ اس کو حجت نہ سمجھو"[1]

علامہ ابن خلکان کی رائے ہے کہ "امام صاحب امام المحدثین تھے، انھوں نے مسند کی تالیف اور اس میں ایسی حدیثیں جمع کیں جن کو جمع کرنا دوسروں کے لیے ممکن نہ تھا"[2]

مصر کے مشہور عالم احمد عبد الرحمن بنا ساعاتی فرماتے ہیں: "امام صاحب کا امت پر بڑا احسان اور ان کا قابل تعریف کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے لوگوں کے لیے اپنی مشہور کتاب مسند احمد کی تخریج کی جس کی اہمیت کا ہر زمانہ کے محدثین نے اعتراف کیا اور کہا ہے کہ وہ تمام کتب سنت میں صحیحین کے بعد سب سے زیادہ صحیح اور حدیثوں کی جامع ہے، ایک مسلمان کو دنیا و آخرت میں جن چیزوں کی احتیاج ہو سکتی ہے، بلاشبہ وہ سب اس میں موجود ہیں، اس طرح اس کتاب کا نفع اور اس کی برکت ہمیشہ جاری رہی اور سنت نبوی کے عظمت شناس برابر اس کے قدردان رہے، اور جب تک دنیا میں اسلام اور مسلمان باقی ہیں، ان کا یہ عمل قابل قدر اور مشکور سمجھا جائے گا"[3]

علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ:

بل هی ذب عن هذا المصنف	میری اس ناچیز تالیف کا مقصد اس کتاب عظیم
العظیم الذی تلقته الامة	کی مدافعت ہے جس کو امت میں قبولیت
بالقبول والتکریم وجعله	و عزت حاصل ہوئی اور جس کو امام احمد نے
امامهم حجة یرجع الیه	ایسا رہنما اور حجت بنایا ہے جس کی جانب
ویعول عند الاختلاف[4]	رجوع اور اختلاف کی صورت میں جس پر اعتماد کیا جائے،

متاخرین علماء نے ایک محدث کیلئے جن کتابوں کے مطالعہ اور حفظ کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے،

---

۱ طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۰۲ ۲ وفیات الاعیان ج ۱ ص ۲۰ ۳ الفتح الربانی ص ۲ تا ۹ ۴ القول المسدد ص ۲ و ۳

ان میں ایک مسند احمد بھی ہے[1]

اس قسم کے اقوال و آرا مسند کی اہمیت اور امت میں اس کی مقبولیت کے شاہد ہیں،

کتب حدیث میں مسند احمد کا درجہ

یہ صحیح ہے کہ مسانید کا مرتبہ محدثین کے نزدیک کتب سنن کے برابر نہیں ہے کیونکہ ارباب مسانید کی شرط صرف اس قدر ہوتی ہے کہ وہ ہر صحابی کے مرویات و احادیث کو الگ الگ مرتب اور ان کی تمام روایتوں کا استقصاء کر دیں، ان کی نظر نہ تو ابواب پر ہوتی ہے اور نہ قابل احتجاج روایات پر[2]، لیکن مسند احمد بن حنبل عام مسانید کی طرح نہیں ہے، امام صاحب نے اس کی صحت میں بڑا اہتمام اور تالیف میں غیر معمولی احتیاط سے کام لیا ہے، اس لیے علماء و محدثین نے اسکو عام مسانید سے ممتاز اور برتر بتایا ہے، شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے کتب حدیث کے اقسام و طبقات بیان کرتے ہوئے اس کو کتب صحاح کے قریب قریب بتایا ہے، اور عام جوامع و مسانید میں اس کا شمار نہیں کیا ہے،[3] اس اعتبار سے اول درجہ کی کتابوں موطا اور صحیحین کے بعد جن کتابوں کا مرتبہ اور درجہ ہے، ان میں مسند ابن حنبل بھی ہے،

علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ "وہ انتخاب و تحریر کے لحاظ سے ان کتابوں سے بہتر ہے جن کے مصنفین نے جمع و ترتیب میں صحت کا التزام نہیں کیا ہے، اس میں صحیحین کے مقابلہ میں جو زوائد ہیں وہ ترمذی اور ابوداؤد کے زوائد کے مقابلہ میں کم ضعیف ہیں اور اس کی ہر روایت مقبول اور ضعیف روایتیں بھی حسن سے قریب تر ہیں"[4]

اس کے بارہ میں امت کا فیصلہ یہ ہے:-

فهذه هی الکتب مع موطاء	یہی کتب صحاح ستہ بشمول موطا امام مالک
الامام مالک ومسند الامام	و مسند احمد اصل دارومدار اور اعتماد

---

۱ تدریب الراوی ص ۶۰ کشف الظنون ج ۱ ص ۲۶۴ ۲ التنقیح فی اصول الحدیث ص ۴۰ ۳ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۰۷ ۴ مجموعۃ الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۸ و الفتح الربانی ص ۸

احمد هی التی علیها المعول و	کی چیز ہیں اور جو روز روشن کی طرح
والمدا سرو هی التی اشتهرت اشتهار	نمایاں اور مشہور ہیں
الشمس فی رابعة النهار[1]	

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ "مسند احمد کی حدیث کی نوعیت عام کتب مسانید کی حدیثوں سے مختلف ہے"[2]

ابوالحسن علی بن احمد ہیثمی لکھتے ہیں کہ "وہ دوسری کتابوں کے مقابلہ میں زیادہ صحیح اور بہتر ہے"[3]

مصری عالم عبدالعزیز خولی لکھتے ہیں "کتب مسانید کا درجہ کتب سنن سے کمتر ہے، اس لیے کہ ان کے مصنفین ہر صحابی کی مسند میں ان کی تمام روایات کو اکٹھا کر دیتے اور صحیح و سقیم میں امتیاز نہیں کرتے ہیں، اسلیے ان سے مطلق اور بلاقید استدلال جائز نہیں، مگر محدثین نے مسند احمد کو ان سے مستثنیٰ قرار دیا ہے"[4]

ان اقوال اور تفصیلات سے مسند کے مرتبہ اور درجہ کا خود بخود تعین ہو جاتا ہے اگر وہ دوسرے درجہ کی کتابوں یعنی صحاح کے بالکل تو نہیں لیکن قریب قریب برابر اور عام مسانید و جوامع سے جو تیسرے طبقہ میں خیال کیجاتی ہیں بہتر اور اہم ہے، اس لیے موطا، صحیحین اور ابوداؤد، ترمذی نسائی اور ابن ماجہ کے بعد اسی کا درجہ ہے، چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں:-

وکاد مسند احمد یکون من جملة	قریب قریب مسند احمد کا نمبر بھی اسی دوسرے
هذه الطبقة فان الامام احمد جعله	درجہ کی کتابوں میں آتا ہے، اس لیے کہ
اصلا یعرف به الصحیح والسقیم قال	امام احمد نے اس کو صحیح و سقیم میں امتیاز کیلئے
مالیس فیه فلا تقبلوه[5]	اصل قرار دیا اور فرمایا ہے کہ جو روایت
	اس میں نہ ہو اس کو قبول نہ کرو۔

---

[1] مقدمہ تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۱۰۔ [2] تدریب الراوی ص ۵۰ [3] ایضاً [4] مفتاح السنہ ص ۳۴
[5] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۰۷

خصوصیات

مسند کی اہمیت اور درجہ کے تعین کے بعد اس کی خصوصیات پر بھی ایک نظر ڈال لینا مناسب ہوگا۔

۱- مسند احمد کی سب سے پہلی خصوصیت تو یہی ہے جس کی تفصیل اوپر مذکور ہوئی یعنی علمائے حدیث نے اس کو بھی حدیث کی اہم اور صحیح کتابوں کے زمرہ میں شامل کیا ہے، اور قریب قریب انہی کی طرح مستند و معتبر قرار دیا ہے،

۲- اس وقت حدیثوں کے جو مجموعے موجود ہیں، ان میں صحت و وثوق کے لحاظ سے بعض کتابوں کا پایہ مسند سے بلند ہے لیکن اس سے بڑا اور ضخیم کوئی مجموعۂ حدیث نہیں، علامہ ابن حجر فرماتے ہیں:

قوله واما مسند احمد الی آخره	ان کے اس قول کہ "مسند احمد الی آخرہ"
فکانه اراد انه اکثر هذه الکتب	سے مراد یہ ہے کہ اس میں ان تمام کتابوں
حدیثا وهو کذلک[1]	سے زیادہ حدیثیں ہیں اور یہ واقعہ بھی ہے۔

حافظ ابن کثیر اور ابوبکر ہیثمی (م ۸۰۷ھ) کا بیان ہے کہ "باعتبار کثرت کوئی اور کتاب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی"[2]

۳- تیسری خصوصیت اس کی جامعیت ہے یعنی احادیث کے دوسرے مجموعوں میں جو روایات و احادیث متفرق طور پر پائی جاتی ہیں ان کا بیشتر حصہ اس میں موجود ہے، ایک مرتبہ ابوالحسن علی بن محمد یونینی سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ کو کتب ستہ زبانی یاد ہیں، انھوں نے فرمایا کہ ہاں یاد بھی ہیں اور نہیں بھی لوگوں نے پوچھا یہ کیسے؟ فرمایا کہ مجھے امام احمد کی مسند یاد ہے، جس میں صحاح کی کم ہی حدیثیں نہیں ہیں، یا یہ فرمایا کہ صحاح کے اندر جو کچھ ہے، ان میں سے چند کے علاوہ سب کی اصل مسند میں موجود ہے، اس لحاظ سے گویا میں ان کا بھی حافظ ہوں،[3]

اور بعض علماء کا بیان ہے کہ اگر کسی کو تمام کتابوں کی جامع کسی ایسی کتاب کی ضرورت ہو جسکا

---

[1] تعجیل المنفعۃ ص ۷، [2] المصدر الاحمد بحوالہ حاشیہ الفتح الربانی ج ۱ ص ۳، [3] ایضاً

مصنف بھی عظیم و جلیل ہو تو اسے مسند احمد کا مطالعہ کرنا چاہیے[۱]۔

احمد عبد الرحمن البنا ساعاتی رقمطراز ہیں: "مسند احمد کے بارہ میں ہر دور کے محدثین کو یہ اعتراف رہا ہے کہ وہ کتب سنت میں احادیث کی سب سے جامع کتاب ہے اور جن چیزوں کی ایک مسلمان کو دنیا و آخرت میں ضرورت پڑ سکتی ہے، وہ سب اس کے اندر موجود ہے[۲]"۔

۴۔ مسند احمد کی ایک خوبی اس کا تصنیفی حسن اور اخبار و روایات کا مناسب و بہتر انتخاب بھی ہے، مبصرین اور اہل نظر کو اس کا اعتراف ہے کہ وضع و تالیف کے لحاظ سے وہ بے مثال کتاب ہے، حافظ ابن حجر نے علامہ ابن صلاح کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:۔

وھو اکبر المسانید و احسنھا وضعا و انتقاء[۳]	وہ سب سے اہم اور بڑی مسند اور وضع و انتخاب کے لحاظ سے سب سے بہتر ہے۔

علی بن ابو بکر ہیثمی اور علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں:۔

لا یوازی مسند احمد کتاب مسنداً فی کثرتہ وحسن سیاقاتہ[۴]	مسانید میں کوئی مسند کثرت و حسن بیان میں مسند احمد کے برابر نہیں۔

۵۔ مسند کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ۳۰۰ ثلاثی روایتیں ہیں، اس خصوصیت میں حدیث کی بہت کم کتابیں اس کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔

۶۔ دقت نظر کے ساتھ مسند کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب نے ہر صحابی کے مسند میں کوئی نہ کوئی ایسی روایت ضرور ذکر کر دی ہے جس سے اس کی شخصیت کا اجمالی خاکہ اور کسی اہم خصوصیت کی تصویر سامنے آجاتی ہے، مثلاً حضرت ابو بکرؓ نہایت رقیق القلب اور پورے خشوع و خضوع کے ساتھ نمازیں پڑھتے تھے[۵]۔ حضرت عمرؓ میں غیر معمولی جرأت و بے باکی تھی، اور وہ خلاف حق بات دیکھ کر سخت

---

۱ حواشی سندی ص ۳۱، ۲ الفتح الربانی ص ۹ و ۱۰، ۳ ہدی المسترشدین ص ۳۰۶، ۴ مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۹۰،
۵ مسند احمد ج ۱ ص ۱۲

غضبناک ہو جاتے تھے[۶]، معاملات و مسائل میں رائے و مشورہ (جمہوریت) سے کام لیتے تھے[۷]، حضرت عثمانؓ نرم خو بھی تھے[۸] اور شرم و حیا کا مجسم پیکر بھی[۹]، حضرت علیؓ کے مزاج میں فقر و استغنا تھا[۱۰] اور انکے پاس ایک صحیفہ تھا[۱۱]۔

۷۔ امام احمد کی یہ کتاب گو احادیث کا مجموعہ ہے لیکن اس میں حضرت ابو بکرؓ وغیرہ کے خطبے اور فرامین بھی آگئے ہیں، اسی طرح یہ مسند گو فقہ و احکام کی کتاب نہیں ہے اور نہ امام صاحب کا اس کی تالیف سے بجز خدمت و تدوین حدیث کے کوئی اور مقصد تھا، لیکن فقہائے صحابہ کے فتوے، استفتا، اور بعض فقہی مسائل کا بھی کہیں کہیں ذکر آگیا ہے جس کی وجہ سے اس کو فقہی شان سے بھی یکسر خالی نہیں کہا جا سکتا، اس سلسلہ کی تیسری خوبی یہ ہے کہ بعض بعض واقعات کی پوری اور مکمل تفصیل اس میں آگئی ہے، مثلاً حضرت عمرؓ کے اسلام، حضرت عثمانؓ کی شہادت جس کے لیے انہوں نے مسند عثمان کے آخر میں ایک مستقل باب اخبار عثمانؓ کے نام سے قائم کیا ہے، اسی طرح ہجرت حبشہ، حضرت جعفرؓ اور نجاشی کی گفتگو اور خوارج وغیرہ کے واقعات کی مکمل تفصیل بیان کر دی ہے۔

۸۔ مسند کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس سے امام صاحب کے فنون حدیث میں مہارت اور ژرف نگاہی کا پورا اندازہ ہوتا ہے اور اس اعتبار سے وہ متعدد خوبیوں کی جامع معلوم ہوتی ہے، مثلاً تعدد طرق، متابعات و شواہد، لفظی و معنوی اختلافات وغیرہ کا تذکرہ، رواۃ کے ناموں میں ابہام کی توضیح، اشتباہ کا تذکرہ، راوی اور روایت کے متعلق کوئی تفصیل ہو تو اس کا اور اس نے کسی شک و تردد کا اظہار کیا ہو تو اس کی وضاحت، اضافہ اور حذف کی تصریح، امام صاحب کا اپنے خیالات کا بعض بعض مقام پر تذکرہ، اسی طرح انکے صاحبزادہ عبد اللہ کی متعدد مقامات پر وضاحتیں، راویوں کے مقام و وطن اور خاندان و قبیلہ کی نشاندہی وغیرہ، اسی طرح اگر امام صاحب کے کسی استاذ یا استاذ الاستاذ نے کسی روایت کی خصوصیت سے تصویب کی ہو تو اس کا اور کبھی کبھی خود اپنی تصویب کا بھی ذکر، صحابی تک منتہی روایت کی مرفوعیت و عدم مرفوعیت کی تصریح اور عبد اللہ کا امام صاحب کی کتاب یا املاء سے نقل روایت وغیرہ کا تذکرہ، ان ساری باتوں کا مسند احمد میں ذکر ملتا ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں محدثانہ شان و عظمت پوری طرح موجود ہے۔

(باقی)

---

۶ مسند احمد ج ۱ ص ۱۷ و ۱۸، ۷ ایضاً ص ۲۴، ۸ ص ۶۳، ۹ ایضاً ص ۷۱ و ۷۲، ۱۰ ایضاً ص ۷۷، ۱۱ ایضاً ص ۱۰۰ و ۱۰۲ و ۱۱۸ و ۱۱۹۔

مقالات طریقت

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے حالات میں ایک نایاب تذکرہ

از محمد عضدالدین خاں صاحب ایم اے ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

محمد شاہ کی دلی ہے، لوٹ مار، قتل و غارتگری کا دور دورہ ہے، سکھ، جاٹ اور مرہٹے ہر طرف تباہی مچائے ہوئے ہیں، نادر شاہ کا قتل عام اسی سرزمین میں ہو چکا ہے، ایرانی و تورانی امراء نے بادشاہ کو اپنے ہاتھوں میں کھلونا بنا لیا ہے اور ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی انحطاط اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے، جس دور کی ابتدا محمود غزنوی، ایبک اور التتمش کی رزم آرائیوں سے ہوئی تھی آج وہ بہادر شاہ اول اور محمد شاہ کی بزم آرائیوں اور ہنگامہ ہائے نائے و نوش میں ختم ہو رہا ہے، اور فلسفۂ تاریخ کے مفکر کی یہ صدا فضاؤں میں گونج رہی ہے ؎

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے　　شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

اس سیاسی بدامنی اور معاشرتی پستی کا اثر مذہبی زندگی پر بھی پڑنا ضروری تھا، اگر اللہ کے چند بیدار مغز بندے اس ظلمت اور توہم پرستی کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روکنے کے لیے کمربستہ نہ ہو جاتے اور ان تیز و تند ہواؤں میں مذہب و ثقافت کے چراغوں کو نہ بچاتے تو ان کا بھی وہی حال ہوتا،

ان جواں مرد سپاہیوں میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا نام سرفہرست ہے، انھوں نے اور ان کے خاندان کے دوسرے بزرگوں نے ہندوستان میں اسلام کی وہی خدمت کی جو قرن اولیٰ

کے اکابر نے پوری دنیائے اسلام کی انجام دی تھی، افسوس کہ اسلامی ہند کے اس عظیم فرزند کا صحیح اور غیر جانبدارانہ مطالعہ اب تک نہ کیا جا سکا، کسی نے ان کو اپنے ذاتی فلسفے کے لیے آلۂ کار بنایا، کسی نے ان پر صرف عقیدت و محبت کے باسی پھول چڑھائے، کسی نے سب و شتم کی بارش کی، کسی نے ان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے، آجکل بعض اشخاص اور اداروں نے کام شروع کیا تو وہ بھی ان کی کتابوں کے ترجمے یا ان ہی پرانی ٹیڑھی ترچھی تصویروں کو دوبارہ سامنے لانے تک محدود رہے۔

متقدمین نے شاہ صاحب کے جتنے بھی تذکرے لکھے، ان میں سے اکثر کا یہی حال ہے، نہ ان میں واقعیت ہے نہ تاریخیت، اس لیے ان کے اکثر بیانات دل کو نہیں لگتے اور تصویر کا صحیح رخ سامنے نہیں آتا، ان تذکروں میں ایک تذکرہ مقالات طریقت معروف بہ فضائل عزیزیہ ہے، جسے عبدالرحیم ضیاء حیدرآبادی نے لکھا ہے، یہ کتاب طبع تو آج سے تقریباً سو سال پہلے ہوئی تھی، مگر ایک طویل عرصے سے نایاب تھی، اور اس کے حوالے بھی بہت کم ملتے تھے، اس لیے اس کے متعلق کسی طرح کا خیال نہیں ظاہر کیا جا سکتا تھا، اتفاق سے یہ کتاب راقم کو حیدرآباد کے ایک ذاتی کتب خانے سے دستیاب ہو گئی، اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ یہ تذکرہ قدیم ہونے کے باوجود کسی بھی جدید مفصل اور محققانہ تذکرے سے کم نہیں ہے،

یہ کتاب تین سو بیس [۳۲۰] صفحات پر مشتمل شاہ صاحب کے انتقال کے باون [۵۲] سال بعد ۱۲۹۱ھ میں حیدرآباد میں لکھی گئی اور اس کے دوسرے سال یعنی ۱۲۹۲ھ میں حیدرآباد ہی سے شائع ہوئی، تذکرے کے مصنف محمد عبدالرحیم ضیاء حیدرآباد دکن کے رہنے والے اور شاہ عبدالعزیز صاحب کے خلفاء سے قریبی تعلق رکھتے تھے، وہ شاہ اسحٰق صاحب (خلیفہ و نواسہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب) کے خلیفہ اور شاگرد سید شاہ محی الدین صاحب قادری ویلوری کے مرید بھی تھے، فاضل تذکرہ نگار اسکے علاوہ

اور کتابوں کے مصنف اور صاحب دیوان شاعر بھی ہیں، وہ اس کتاب کے ماخذ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اکثر روایات اہل ہند ثقات سے کہ بعض ان میں صحبت یافتہ حضرت کے ہیں جمع کر کے جو اجزا کہ اس طریق سے حاصل نہ ہوئے، ان کو بذریعہ تحریر جناب فضیلت مآب .... مولانا حافظ حاجی محمد عبد القیوم صاحب دہلوی سلمہ اللہ العزیز القوی داماد و شاگرد حضرت مولانا محمد اسحٰق علیہ الرحمہ سے بعد دریافت و تحقیق کے اس کتاب میں لکھا"[1]

یہ کتاب چھ مقالات (ابواب) اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے، پہلے مقالے میں مصنف نے شاہ صاحب کے مفصل حالات از ولادت تا وفات درج کیے ہیں، یہ باب چوالیس ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کتاب کا سب سے اہم اور پُر از معلومات باب ہے، دوسرا باب "امور متعلق بعلوم ظاہر و باطن" اٹھاون ۵۸ صفحات میں ہے، تیسرا باب شاہ صاحب کی "تعبیر رویا" سے متعلق سترہ ۱۷ صفحات میں ہے، چوتھا باب جو تین ۳ صفحات کا ہے، شاہ صاحب کے "اجوبۂ اسئلہ" سے متعلق ہے، پانچویں باب میں ان کے مختلف سلاسل طریقت کا ذکر بڑی تفصیل سے پینتالیس ۴۵ صفحات میں کیا گیا ہے، آخری باب میں شاہ صاحب کے اجل وارشد خلفاء کے تفصیلی حالات ساٹھ ۶۰ صفحات میں ہیں، خاتمے میں اپنے پیر و مرشد سید شاہ محی الدین قادری ویلوری کے حالات چوالیس ۴۴ صفحات میں لکھے ہیں، کتاب کے ضمیمے میں مولانا محمد زمان شہید کا تذکرہ جو شاہ صاحب کے خاندان کے مشہور خلفاء میں ہیں، ۲۳ صفحات میں ہے،

اس اجمالی تعارف کے بعد اس پر تفصیلی نگاہ ڈالی جاتی ہے، تاکہ اس کی افادیت اور اہمیت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

کتاب کے شروع میں مصنف نے شاہ عبد العزیز صاحب کے سلسلۂ نسب اور آبا و اجداد کے مولد و مسکن وغیرہ کا حال لکھا ہے، اس کے بعد شاہ عبد الرحیم صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب کے

---

[1] مقالات طریقت ص ۴،

حالات کسی قدر تفصیل سے دیے ہیں، اس کے بعد رقمطراز ہیں:

"حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ نے اول اپنے ماموں کی دختر سے نکاح کیا تھا، ان سے مولوی محمد رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے، آپ بڑے ولی کامل تھے، آپ پر جذب ... غالب تھا........ مزار آپ کا مع دونوں فرزند کے بوڈھانہ کی مسجد میں واقع ہے، بعد انتقال والدہ ماجدہ مولوی محمد صاحب کے شاہ صاحب موصوف نے دختر نیک اختر سید ثناء اللہ صاحب ساکن قصبہ سونی پت مسماۃ بی بی ارادہ رحمۃ اللہ علیہا سے شادی کی۔ ان سے چار فرزند پیدا ہوئے، اولین مولانا شاہ عبد العزیز، دوم شاہ رفیع الدین، سوم شاہ عبد القادر، چارم مولوی عبد الغنی اور ایک دختر مسماۃ بی بی امۃ العزیز۔ دختر مذکورہ کو مولوی محمد فایق بن مولوی محمد عاشق ابن شاہ عبد اللہ بن شیخ محمد پھلتی سے شادی کر دی، ان کا سلسلہ اب تک باقی ہے"۔

اس کے بعد شاہ رفیع الدین صاحب، شاہ عبد القادر صاحب اور شاہ عبد الغنی صاحب کی زندگی کے اہم واقعات لکھے ہیں، جو دلچسپی اور معلومات سے خالی نہیں، مگر اس مضمون میں اصل مقصد شاہ عبد العزیز صاحب کے حالات سے بحث ہے، اس لیے طوالت کے خوف سے ان کو حذف کیا جاتا ہے،

مگر اس سلسلہ میں ایک اہم بات فاضل مصنف نے یہ بیان کی ہے کہ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر کے بیعت کے معاملہ میں عام طور پر یہ گمان کیا جاتا ہے کہ چونکہ شاہ ولی اللہ صاحب کے انتقال کے وقت شاہ عبد العزیز کے تینوں بھائی کم عمر تھے، اس لیے جس طرح شاہ عبد العزیز صاحب ان حضرات کے ظاہری مربی تھے، اسی طرح باطنی مرشد بھی رہے ہوں گے، مگر عبد الرحیم ضیاء کے بیان کے مطابق شاہ رفیع الدین صاحب شاہ محمد عاشق پھلتی صاحب سے بیعت و اجازت رکھتے تھے اور شاہ عبد القادر صاحب، شاہ عبد العدل دہلوی سے بیعت تھے، جن کا مزار حضرت خواجہ باقی باللہ کے احاطے میں ہے،

کتاب کا اصل مقصد شاہ عبدالعزیز صاحب کے حالات بیان کرتا ہے، ان کے تذکرے میں لکھتے ہیں :۔

"حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہٗ ...... دراز قد، لاغر اندام، گندم رنگ، کلاں چشم، صاف جسم تھے، گرداگرد چہرے کے لحیۂ مبارک خوشنما باعتدال تھی، اکثر جبہ اس کے نیچے انگرکھہ اور پائجامۂ شرعی، دستار کشمشی کلاہ پنبہ دار رومال بینی اک نیلا اور پاپوش زری اور ہاتھ میں عصا عصائے سبز رکھتے تھے، اخلاق میں تخلقوا باخلاق اللہ کے مصداق تھے، مزاج میں نہایت خوش طبعی اور ہر ایک بات کا مذاق تھا۔"

"ولادت آپ کی شب جمعہ بست و پنجم ۲۵ ماہ رمضان ۱۱۵۹ھ میں ہے اور نام تاریخی آپ کا غلام حلیم ہے، کہتے ہیں کہ اسی شب شب قدر بھی تھی، اور آپ ختم قرآن شریف بھی اسی شب کو کرتے تھے، اور ختم میں شیرینی قسم ریوڑی کے تقسیم فرماتے تھے، آپ کی عمر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ کے انتقال کے وقت سولہ برس چھ مہینے کی تھی، فاتحۂ سوم شاہ ولی اللہ صاحب کا خان دوران خاں کے محل کلاں میں ہوا۔"

"رسم دستار بندی میں تین چار پیچ مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے سر مبارک پر باندھے۔ جناب مرزا مظہر جانجاناں صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی شریک تھے، آپنے علوم ظاہر و باطن اپنے پدر والا قدر سے پڑھا، اور مولوی شاہ عاشق صاحب پھلتی سے اس کی تکمیل کی۔ اور بابا فضل کشمیری سے جو منجملہ ارشد تلامذۂ شاہ ولی اللہ صاحب تھے، بعض کتب حدیث کی سند لی، اور علم فقہ اپنے خسر مولوی نور اللہ صاحب جد مولوی محمد عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہما سے پڑھا، اور اکثر فیوض ظاہر و باطن فرادیہ انوار پدر بزرگوار سے حاصل کرتے تھے، تھوڑے وقت ان کی قبر شریف پہ مراقب رہتے تھے، کوئی علم و فن ایسا نہ تھا کہ جس میں آپ کو دستگاہ کامل نہ ہو۔ خط شکستہ و نسخ خوب لکھتے تھے،

علم موسیقی میں ملکۂ راسخ تھا کہ استادان فن زانوے ادب تہ کرتے تھے، تیراندازی خلیفہ محمد شاکر سے، گھوڑے کی سواری ملک بیڑا افسر چابک سواران محمد شاہ بادشاہ سے سیکھی، تمام ہمفنوں میں برتر اور شاہ وری میں سب سے بڑھ کر، غرض آپ کی ذات جامع کمالات معاصرین پہ فائق بلکہ کمیاب روزگار تھی، اور فیض باطن حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے آپنے پایا ہے ...."

"اور تین موضع آپ کی جاگیر تھی، ان کی سند عالم بادشاہ اور دولت راؤ سندیہ نے گزرانی تھی حسن پور اور مراد آباد پرگنہ سکندر آباد سے چاروں بھائیوں میں مشترک اور ایک موضع یعنی محل جبنہ پرگنہ بوڈھانہ سے بلا شرکت آپ کے تصرف میں تھا، چنانچہ وہ موضع اپنے دونوں نواسے مولانا محمد اسحٰق اور مولانا محمد یعقوب کو عطا کیا تھا، اب تک جاری ہے، مولوی نصر اللہ خاں صاحب کہتے ہیں کہ میری عملداری میں محل جبنہ کے سالانہ بارہ سو روپئے گلدار ہوتے تھے اور اب بھی وہی ہے سوا اس کے اکثر جا سے فتوحات بلا قید سال و ماہ اللہ تعالیٰ پہنچاتا تھا، جو شخص کچھ گذرانتا تو قبول فرماتے اور نہ دیتا تو ذکر تک بھی نہ لاتے، خدمت طلبا اور فقراء وغیرہ کی بہت کرتے تھے، گویا جود و کرم آپ کا سرشت تھا، جو سائل آتا تھا بے نیل مرام نہ جاتا تھا۔"

اس کے بعد شاہ صاحب کے درس و تدریس، تربیت باطن اور تصنیف کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

"جاننا چاہیے کہ دنیا میں فیض بخشی کے بہت طریقے ہیں، مگر ان میں تین طریقے مشہور و معروف ہیں، ایک تدریس دوسرا تربیت باطن جسے مریدی کہتے ہیں، تیسرا تصنیف، اور یہ ابواب منجملہ بہترین باقیات الصالحات ہیں، ان امور میں حضرت کا پایۂ بلند اور رتبۂ ارجمند تھا، تدریس کا یہ حال کہ ہندوستان وغیرہ میں کوئی عالم کم نکلے گا جس کو حضرت سے واسطہ نہ ہو، کہتے ہیں کہ ایک بدایوں کے عالم نے حدیث شریف پڑھنے کا ارادہ کیا، مگر اس کو نادانی سے یہ خیال آیا کہ

اس شخص سے پڑھے کہ جس کے سلسلے میں شاہ عبدالعزیز نہ ہوں، تمام ہندوستان پھرتے پھرتے حیران ہوا۔ جہاں گیا وہاں حضرت ہی کا فیض پایا، کوئی ایک واسطے سے کوئی دو یا تین واسطے سے حضرت کا شاگرد نکلا، یہ بات ایسی ہے کہ جیسے کسی نے انسانوں میں اپنی نسبت کرنی چاہی مگر یہ قید لگائی کہ اس خاندان میں ہو جس میں حضرت آدم علیہ السلام نہ ہوں"۔

"مگر آپ نے مستقل بجز چار پانچ شخص کے اور وں کو بہت کم پڑھایا ہے، یعنی اپنے تینوں بھائیوں کو کہ رفیع الدین صاحب والد کے انتقال کے وقت مبتدی اور عبدالقادر صاحب صرف میر پڑھتے تھے، اور عبدالغنی صاحب قرآن شریف حفظ کرتے تھے، تمام علوم پڑھایا اور اپنے داماد مولوی عبدالحی صاحب کو، مولوی عبدالقیوم صاحب، مولانا اسحٰق صاحب علیہ الرحمہ سے نقل کرتے ہیں کہ مولانا صاحب مجھ سے فرماتے تھے، میں نے کسی کو نہ دیکھا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہٗ جیسا علیہ آشوب چشم کے بھی پڑھائے ہوں مگر تمہارے والد مولانا عبدالحی صاحب کو اور جناب غلام علی شاہ صاحب مجددی علیہ الرحمہ بھی شاگرد ہیں، بخاری شریف پڑھی ہے۔[1] ان حضرات کے سوا اگر کسی کو پڑھایا ہے تو تین چار سبق سے زیادہ نہیں پڑھایا

"اور صبح کو جو ایک رکوع قرآن شریف کا قریب طلوع آفتاب ہر روز ایک تفسیر کے ساتھ سنا کرتے تھے، یہاں تک کہ روز وفات بھی سنا ہے، اس کے قاری خاص مولانا اسحٰق صاحب ہوتے تھے۔...... اور آپ کے برادروں کے ساتھ مولوی مفتی الٰہی بخش صاحب ساکن کاندھلہ اور مولوی قمرالدین صاحب منت تخلص وغیرہ سامع تھے، اسی طریق سے انھوں نے تحصیل کی"۔

شاہ صاحب کے درس اور شاگردوں سے متعلق اس کتاب کی روایت انوکھی اور عجیب سی ہے، مصنف لکھتے ہیں:۔

---

[1] ان حضرات کے علاوہ تذکرہ نگار نے شاہ ابوسعید صاحب کو بھی شاہ صاحب کا شاگرد بتلایا ہے۔

"مولوی عبدالقیوم صاحب فرماتے ہیں، میں نے مولانا اسحٰق صاحب سے پوچھا کہ حضرت اکثر لوگ جو کہتے ہیں کہ ہم شاہ صاحب کے شاگرد ہیں، شاہ صاحب نے ہمیں تعلیم کی ہے، اس کی کیا حقیقت ہے، آپنے فرمایا کہ بجز نابینا ہونے کے شاہ صاحب سے پڑھنے کی دو صورتیں تھیں، ایک تو میں صبح کو قرآن شریف کا رکوع پڑھتا تھا اس میں لوگ سامع رہتے تھے، دوسرے یہ کہ علماء و فضلا اور بڑے بڑے بزرگوار اطراف سے حاضر ہو کر حصول اجازت تیمناً تبرکاً چاہتے تو حضرت شاہ صاحب فرماتے کہ چہل قدمی کے وقت پڑھیں میں سنوں گا، اس وقت کچھ بیان بھی کرتے تھے، اس قسم کے شاگرد بے شمار ہیں، سوا اس کے جمعہ اور منگل کو قرآن شریف کا درس بطور وعظ کے ہوتا تھا، اسکی کیفیت مرزا احمد علی شاہ صاحب قادری چشتی اپنے استاد مولوی یار محمد صاحب مرحوم کی زبانی جو حضرت کے شاگردوں میں سے تھے، یوں بیان کرتے ہیں کہ آپکے وعظ میں ہزار ہا آدمی رہتے تھے، ان میں جو پڑھے لکھے تھے وہ لوگ ایک ایک تفسیر اپنی اپنی استعداد کے موافق عربی ہو یا فارسی لیکر بیٹھے رہتے، جب کوئی آیت شروع کرتے تو حضرت ہر ایک سے پوچھتے کہ امام رازی کیا معنی کرتے ہیں اور شیخ محی الدین ابن عربی کیا فرماتے ہیں اور قاضی بیضاوی کیا لکھتے ہیں، علیٰ ہذاالقیاس جس کے پاس جو تفسیر ہوتی وہ اپنا بیان کرتا، جب سب تفسیریں ہو جاتیں تب آپ فرماتے، خیر یہ سب بیان ہو چکا، اب جو خدائے تعالیٰ نے اس فقیر کے دل پر القا کیا ہے بیان کرتا ہوں، پھر وہ مضامین بیان کرکے فرماتے کہ کسی مفسر کے حاشیہ خیال میں بھی نہ آئے ہوں، سب لوگ کتابیں بند کرکے حضرت کا منہ تکتے رہتے اور ششدر ہو جاتے۔...... مولوی یار محمد صاحب علیہ الرحمہ مدتوں خدمت فیض درجت میں رہے ہیں اور کئی دورے قرآن مجید کے ان کے روبرو ہوئے ہیں، ان دوروں کا قرآن مجید شروع سے آخر تک محشیٰ ان کے فرزند مولوی محمد اسحٰق صاحب کے پاس موجود ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب بھی اسی طرح درس فرماتے تھے،

اخیر درس ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم تھا، وہاں سے حضرت نے شروع کیا اور حضرت کا آخری درس آیۂ ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم تھا، حضرت کے بعد وہاں سے مولانا اسحٰق صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے شروع کیا"۔

شاہ صاحب کے درس و تدریس کی کیفیت سننے کے بعد ان کے تصوف اور طریقۂ تربیت باطن کا بھی کچھ حال تذکرہ نگار کی زبانی سنیے، یوں تو انھوں نے اس کا ایک مستقل باب ہی قائم کیا ہے مگر اس باب میں بھی مختصراً رقمطراز ہیں:

"تربیت باطن کی یہ کیفیت ہے کہ آپ کو تمامی آداب سکون اور اشتغال طریقت میں دستگاہ کامل اور ملکۂ راسخہ تھا، جیسا چاہتے تھے ویسا طالبوں کو خدا تک پہنچاتے تھے، کوئی طریقے کے مقید نہ تھے، کیونکہ اپنے عزیز و اقارب برادروں کی اولاد یعنی مولوی مخصوص اللہ صاحب اور مولوی اسمٰعیل صاحب[1] اور مولوی یعقوب صاحب اور مولانا اسحٰق صاحب وغیرہ سے قادریہ طریقت میں بیعت لی تھی، اور امراء کو سلسلۂ چشتیہ میں اور دوسروں کو سلسلۂ نقشبندیہ میں مرید کرتے تھے۔ چنانچہ جناب سید احمد صاحب طریقۂ نقشبندیہ میں مرید تھے مگر مولانا عبدالحی صاحب کو مولانا شاہ عبدالقادر صاحب سے بیعت تھی، اور شاہ صاحب خود صاحب طریقہ ہیں، کیونکہ آپ نے بعد تکمیل سلوک راہ ولایت اور سلوک راہ نبوت کے خاص ایک طریقہ سلوک راہ ولایت کا برعایت طبائع ابنائے روزگار استخراج کیا ہے، وصول الی اللہ کے واسطے نہایت آسان و سہل ہے، اس ہیچمیرز نے اس خاص سلوک طریقہ علیہ عزیزیہ کو مقالۂ پنجم میں لکھا ہے .... اور حضرت کی توجہ وغیرہ کا کوئی وقت مقرر نہ تھا، اگر کوئی خواہاں ہوتا

[1] مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحی صاحب کے شاہ صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب سے بیعت ہونے میں راقم کو اختلاف ہے، عام روایت کے مطابق یہ بزرگ سید احمد شہیدؒ سے بیعت تھے، ممکن ہے ان میں سے کسی ایک نے تبرکاً بیعت کی ہو اور باقاعدہ تعلیم بعد میں سید احمد شہیدؒ سے حاصل کی ہو، بہرحال یہ بات تحقیق طلب ہے۔

تو فرماتے کہ تم غلام علی شاہ صاحب کے پاس جاؤ کہ وہ صاحب طریقہ اور دکاندار اور اس کام کے ذمہ دار ہیں، یہ فقیر طریقۂ تعلیم علوم ظاہری رکھتا ہے، اس پر بھی کوئی بہت خواہش اور الحاح کرتا اور آپ کے ذہن عالی میں آتا تو اس کے واسطے ایک وقت معین فرماتے اور جاے مقرر کرتے، مثلاً کسی کو بعد نماز مغرب اور کسی کو بعد نماز ظہر یا دوسرے وقت جو مناسب جانتے تعین کرتے، جیسے جناب سید احمد صاحب اور سید اللہ دیا صاحب برہان پوری اور مولانا یعقوب صاحب اور شیخ غلام جیلانی صاحب باغ پتی اور حافظ قطب الدین صاحب پھلتی، یہ اکابر حضرت سے توجہ لیے ہیں اور تکمیل کو پہنچے ہیں۔ ......"

شاہ عبدالعزیز صاحب کی تصانیف کے سلسلے میں بھی اس کتاب کی روایتیں کچھ کم اہم نہیں ہیں، اس سے ان کی بہت سی تصانیف کے بارے میں شبہات اور ابہام دور ہوجاتا ہے، لکھتے ہیں:۔

"خوبی تصانیف کی تمام زمانے پر ظاہر و باہر ہے، بیان کی احتیاج نہیں، تفسیر فتح العزیز، تحفۂ اثنا عشریہ، سر الشہادتین، بستان المحدثین، عجالۂ نافعہ، حواشی قول الجمیل، یہ تمام کتابیں مشہور و مطبوع ہیں، سوا ان کے علم معانی میں ایک رسالہ ہے۔ سوا اس کے صدرہ اور میرزاہد رسالہ پر بھی حواشی ہیں، حاجی محمد حسین صاحب سہارنپوری سلمہ اللہ تعالیٰ مولوی نور اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کی ایک تفسیر فارسی تمام قرآن مجید کی اکبرآباد کے قاضی کے یہاں موجود ہے مگر وہ چھپی نہیں۔ تفسیر فتح العزیز کے لکھنے کا سبب یہ ہوا کہ آپ کی ایام جوانی میں عادت تھی کہ بعد نماز عصر تشریف رکھتے، اخبار دیار و امصار گوش زد ہوتے، دوسرے سخن و قصص بھی درمیان آتے اور اشخاص اسی قسم کے جمع ہوتے تھے، چنانچہ ایک کایستھ بھی درباریوں سے بادشاہ شاہ عالم کے اسی وقت حاضر ہو کر قصص دیار عرض کرتا، آخر کار وہ کایستھ فیض صحبت سے مسلمان ہو کر

شیخ مصدق الدین نام پایا، اور کمال کو پہنچا، ان ہی کے حسب استدعا ۱۲۰۸ھ میں تفسیر
شروع ہوئی، چنانچہ خود بدولت دیباچے میں تفسیر کے یہ کیفیت مفصل تحریر فرمائے ہیں
شیخ مصدق الدین کے فرزند مولوی کرم اللہ صاحب بڑے فاضل اور ولی کامل خلفا سے
غلام علی شاہ صاحب کے ہوئے ہیں۔"

"مرزا عمر علی شاہ صاحب قادری چشتی اپنے استاد مولوی یار محمد صاحب مرقوم الصدر سے
روایت کرتے ہیں، تفسیر کے ناتمام رہنے کی وجہ یہ ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و اصحابہ وسلم نے خواب
میں جناب شاہ صاحب کو فرمایا کہ تم تفسیر لکھنا موقوف رکھو، اگر تمام کروگے تو اور تمام مفسرون
کی محنت بے فائدہ ہوگی، کوئی کسی کی تفسیر نہ دیکھے گا، تمھاری اتنی ہی تفسیر کوئی سمجھے تو تمام
قرآن کے مضامین پر حاوی ہوگا، آپ نے حسب الحکم موقوف کیا، سورۂ بقرہ ناتمام رہا
واقعی ایسی ہی تفسیر نادر ہے کہ اس کے وصف میں زبان قاصر ہے، باوجود ضوابط
علم تفسیر کے صحت روایات و آداب سلوک و اسرار حقایق و نکات معارف ایسے
ہیں کہ اور تفاسیر میں کم ہوں گے، جناب امام رازی قدس سرہ نے آیت کا ربط
آیت سے دیا ہے، حضرت نے سوا اس کے سورہ کو سورہ سے مربوط کیا ہے،
ان کی تحریر کا یہ حال تھا کہ مسودہ کا اتفاق نہ ہوا، اور جو لفظ فرمایا پھر دوبارہ وہ زبان
پر نہ آیا، مولوی حیدر علی صاحب منتہی الکلام سلمہ اللہ تعالیٰ نے جو حضرت کے آخر وقت
کے مستفیضوں میں سے ہیں، حسب خواہش سکندر بیگم مغفورہ والیۂ بھوپال تفسیر مذکور
کا تکملہ ستائیس جلدوں میں کیا ہے، راقم نے دیکھا ہے، بہت خوب لکھا ہے، اس
عصر میں ایسی استعداد و لیاقت کی فرد نایاب ہے، دوسرے کا منہ نہیں جو یہ ہمت
کرسکے۔ مگر دونوں کا فرق کرنے والا اپنے حوصلے کے مطابق سمجھ سکتا ہے۔[1]

[1] (حاشیہ ص ۱۹۵ پر ملاحظہ ہو)

"تحفہ اثنا عشریہ بھی آپ کی زندگی میں یعنی ۱۲۱۷ھ میں طبع ہو کر مشہور ہوئی،
اور وہ بھی ایسی ہی بے ساختہ لکھی گئی[1]، کہتے ہیں کہ جب تحفہ اثنا عشریہ چھپ کر شہرت پائی
تو ایک کلکتہ کا کوئی نواب شیعہ مذہب تھا، اس کو نہایت شاق گذرا، اس نے وہ کتاب
اور بہت سے روپے ایران کو روانہ کرکے وہاں کے فضلا اور علما کو لکھا کہ یہاں
سنیوں کو اس کتاب کی عبارت اور مضمون پر ناز ہے، چاہیے کہ دونوں کا رد ہووے،
ایران میں تمام فضلا اور ارباب انشا جمع ہو کر مدت دراز تک تمام کتاب بکرات
ومرات دیکھی، کچھ نہ ہوسکا، آخر کو وہ روپے سب چکھ چکھا کر اس کے جواب میں
ایک نامہ لکھ کر روانہ کیا، اس کا مضمون یہ تھا کہ صاحب تحفہ نے جو اپنے مذہب
کی قدیم کتابوں کا حوالہ دیا ہے، اس ملک میں وہ مذہب صدہا سال سے اٹھ جانے
کے سبب سے وہ کتابیں بہم دست نہیں ہوسکتیں اور جو ہمارے مذہب کی قدیم کتابیں
اس میں مذکور ہیں ہم نے اب تک دیکھا نہیں، مضمون کا رد تو کتابوں کی قدرت پر موقوف
ہے، رہی عبارت ایسی صاف اور بے تعقید کس منشی کا منہ ہے جو لکھ سکے، سبحان اللہ۔"

"آپ سے نظم و نثر بھی بہت یادگار ہے، اس محل پر برکتاً فقط ایک بیت، ایک
قطعہ اور ایک قصیدے پر اکتفا کیا۔[2]"

(حاشیہ ص ۱۹۴) شاہ صاحب کی تفسیر فتح العزیز کے سلسلے میں بہت سے شواہد اور نادر و معتبر روایات راقم کو فراہم ہوئے ہیں
جن کی روشنی میں مختلف اور حیرت انگیز نتائج برآمد ہوتے ہیں، چونکہ یہ بحث طویل ہے اس لیے اسے الگ مقالے کی شکل
میں عنقریب پیش کیا جائے گا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] تحفہ کا یہ نسخہ بہت ہی اہم ہے، یہ پہلی بار تین سو کی تعداد میں ۱۲۱۵ھ میں کلکتہ سے شائع ہوا،
راقم کی نظر سے اس کے دو نسخے گذرے ہیں [2] اس کتاب میں جو اشعار ہیں وہ اور انکے علاوہ دیگر مخطوطات و مطبوعات
سے جو اشعار مل سکے ہیں، انکی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے جو راقم کے پاس موجود ہیں، اس کے علاوہ بعض نادر
ادبی رقعے و تشریحات ایک الگ مضمون کی شکل میں پیش خدمت ہوں گے۔

فاضل تذکرہ نگار نے شاہ صاحب کی وفات کی بھی جو کیفیت بیان کی ہے، اس کی تفصیلات موجودہ روایات میں بیش قیمت اضافہ ہیں، ان سے اصل واقعات کی تمام کڑیاں مل جاتی ہیں، مصنف رقمطراز ہیں:-

"آپ بہت قلیل الغذا اور کثیر الامراض تھے، جب وقت قریب آیا تو چند روز سے غذا ترک کی، مرض کی شدت تھی، وعظ کا دن آیا، آپ نے فرمایا مجھ کو پکڑے رہو جب بیان شروع کروں تو چھوڑ دینا، ویسا ہی کیا یعنی قوت روحانی اور فیض ربانی کا غلبہ ہوا، آپ کو چھوڑ دیا، وعظ فرمانے لگے ہزاروں آدمی جمع ہوئے، اس حال میں بھی جیسا دور والے سنتے تھے ویسا ہی نزدیک والے بھی سنتے تھے بعد ازاں آیۂ شریفہ ذوی القربیٰ والیتمیٰ والمسٰکین وابن السبیل کا بیان کیا، اسکے مطابق نقد اور اسباب سب تقسیم فرمایا، من بعد قریب لاکھ روپئے کے نقد اور دوسرا اسباب بیش قیمت جو رہا تھا اس میں سے چند ہزار روپئے واسطے زاد راہ سفر حجاز اور ادائے مناسک حج و عمرہ وغیرہ کے اپنے نواسے مولانا محمد اسحٰق اور مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہما کو عنایت کیے اور چند ہزار روپئے مصارف مراسم وفات و تعزیت کے لیے دیے، بعد ازاں کچھ اشعار عربی اور فارسی پڑھے، اور بہت شعر ایسے کہ ایک مصرع دوسروں کا اور ایک مصرع اپنا، چنانچہ یہ شعر مشہور قدسی علیہ الرحمہ کا ؎

روز قیامت چوں شود ہر کس بگیرد نامہ — من نیز حاضر می شوم تصویر جاناں در بغل

بجائے مصرع ثانی آپ نے فرمایا

من نیز حاضر می شوم تفسیر قرآں در بغل

پھر فرمایا کہ میرا کفن ایسے کپڑے کا ہو جو میں پہنے ہوں، کرتا آپ کا ادھوتر کا اور پاجامہ گاڑھے کا ہوتا تھا، اور فرمایا کہ جنازے کی نماز باہر شہر کے ہو، اور بادشاہ میرے جنازے پر نہ آوے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، ساتویں تاریخ ماہ شوال روز یکشنبہ ۱۲۳۹ھ وقت طلوع آفتاب کے ربع پہر

اس عالم گذران سے جانب عالم جاوداں روانہ ہوئی جس جائے آپ کو غسل دیا گیا تھا وہ خاک معطر ہوئی تھی، بہت لوگوں نے اپنے مکان میں اس کو رکھا تھا، اول بار دروازہ ترکمان دہلی کے باہر مولانا محمد اسحٰق صاحب نے امام ہو کر نماز پڑھائی، بعد ازاں نصیر الدین صاحب لکھنوی کی شافعی کے مقبرے میں جماعت سے نماز ہوئی، یہاں تک کہ پچپن بار جنازے کی نماز پڑھی گئی، جوق در جوق آتے تھے اور پڑھتے تھے بعض مقامات میں غائبانہ بھی نماز ہوئی ہے، مزار پرانوار آپ کا شاہجہان آباد کے باہر دہلی دروازے کی سمت مہندیوں کے قریب خوش نزور کے چھتے میں واقع ہے[1]، اصل میں کوشک انور اس جائے کا نام تھا، اب زبان زد عوام خوش نور کا چھتہ مشہور ہے، اور شیخ عبد الرحیم صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبد القادر صاحب، مولوی عبد الغنی صاحب اور مولوی مخصوص اللہ صاحب وغیرہ قدس اللہ اسرارہم، ان سب کے مزار وہیں ایک ہی احاطے میں ہیں۔"

اس کے بعد شاہ صاحب کی تاریخ وفات کے شاہ رؤف احمد مجددی، ارتضا علی خاں صاحب گوپاموی اور حکیم مومن خاں مومن وغیرہ کے قطعات تاریخ درج کیے ہیں جس سے یہ پوری طرح واضح ہوتا ہے کہ شاہ عبد العزیز صاحب کا انتقال ۱۲۳۹ھ میں ہوا تھا، نہ کہ ۱۲۴۸ھ میں، اصل میں موخر الذکر سال سب سے پہلے سر سید نے شاہ صاحب کے تذکرے میں آثار الصنادید میں غالباً غلطی سے لکھ دیا تھا، اسکے بعد سے متعدد تذکرہ نویسوں، مثلاً رحمان علی[2]، رحیم بخش دہلوی[3] اور اسماعیل گودھوری وغیرہ نے بھی سر سید سے نقل کر کے لکھا ہے حالانکہ سر سید کی اس روایت کے خلاف بہت سارے نوادر قلمی خطوط اور تذکرے

---

[1] یہ جگہ میر درد روڈ کے سامنے جیل خانہ اور مولانا آزاد میڈیکل کالج کے پیچھے واقع ہے اور اب قبرستان مہندیوں کے نام سے مشہور ہے، اسی قبرستان میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی مرحوم کو بھی دفن کیا گیا ہے۔

[2] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۲ [3] حیات دلی ص ۶۲۳

کی شکل میں موجود ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ یہ قدیم تذکرہ اور اس کے ساتھ مختلف ہمعصروں کے قطعات تاریخ وفات سر سید اور ان سے نقل کرنے والے حضرات کی تردید ہوتی ہے۔

تذکرہ نگار نے اس کے علاوہ اور بہت ساری باتیں اس کتاب میں ایسی درج کی ہیں جو کسی اور تذکرے میں اب تک نہیں ملتیں مگر طوالت کے خوف سے ان کو حذف کیا جاتا ہے اور صرف انکی موسیقی کے سلسلے کی چند روایتیں ناظرین کی خدمت میں پیش ہیں[1]

"روایت ہے کہ حاجی محمد حسین صاحب سہارنپوری کا سے وہ روایت کرتے ہیں مولوی وحید الدین صاحب پھلتی سے کہ وہ شاگرد ہیں مولانا اسمعیل شہید کے اور خلیفہ ہیں سید احمد صاحب قدس سرہ کے اور تیرہ سال حضرت شاہ صاحب اور مولانا عبدالقادر صاحب قدس سرہما کی خدمت میں رہے ہیں، کہا انھوں نے کہ نواب نصراللہ خاں والی رامپور کے یہاں ایک قوال مسمی ہمت خاں بڑا صاحب کمال تین سو روپئے ماہوار کا نوکر تھا، تمام گویئے اسکو مانتے تھے ثانی تانسین جانتے تھے، ایک دن اسکو خیال آیا اگرچہ مجھکو تمام لوگ بڑا کمال والا جانتے ہیں، اس کا کچھ اعتبار نہیں، میں اپنے ہنر کو جب تک حضرت کے محک امتحان پہ عرض نہ کروں اور ان کی زبان سے سند نہ لوں تو کیونکر اپنے کو کچھ چیز سمجھوں کس لیے کہ اس زمانے میں اس ذات جامع الکمالات کی جیسی کوئی ذات نہیں اور کمال وہی معتبر ہے جو اہل کمال پسند کریں اور داد دیں ...... اسی آرزو میں دہلی کو آیا وہ حضرت کا آخر زمانہ تھا کہ بینائی سلب ہو گئی تھی اور تمام حواس میں ضعف طاری تھا، روبرو حاضر ہو کر سلام کیا، آپنے سلام کا جواب دیا اور فرمایا کہ آؤ ہمت خاں اچھے ہو، سنتے ہی نہایت حیران وششدر رہا، اور تمام حضار متعجب ہوئے کہ یہ شخص تو کبھی یہاں نہیں آیا اور نہ کبھی حضرت نے اس کی آواز سنی اور نہ صورت دیکھی، یہ کیا بات ہے کہ اس کا نام لے کر پکارا، اس نے بھی

[1] شاہ عبدالعزیز صاحبؒ موسیقی کے بہت اچھے عالم تھے، تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ "شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی ایک نایاب تصنیف" معارف اکتوبر دسمبر ۱۹۷۲ء

استفسار کیا تو فرمایا کہ تمھارے گانے کا لوگ ذکر کیا کرتے تھے کہ ان کی آواز میں یہ بات ہے اور اس طرح کا اتار چڑھاؤ ہے، وہ بات صاف تمھارے تکلم سے پائی گئی تو میں نے جانا کہ اس انداز کا تمھارے سوا کوئی نہیں ہے، جب اس نے اپنا مدعا عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں اپنا جوہر حضرت کے روبرو عرض کروں، ارشاد ہوا کہ مناسب، پھر حضرت نے ایک دن حضرت شاہ رفیع الدین صاحب اور مولانا عبدالقادر صاحب وغیرہ بڑے بڑے کملا کو جمع کیا اور کوئی اغیار رہنے نہ پایا تب اس کی یاد ہوئی، اور وہ گانے لگا، جو جو چیزیں اس کو یاد تھیں سب سنا دیں، تمام حضار کو رقت ہوئی، حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کہ نہایت مستقل مزاج تھے، ان کے بھی اشک جاری ہوئے، چادر منہ پر ڈالے ہوئے بیٹھے رہے، اور حضرت بھی کھنڈ ولے پر جنباں تھے، جب وہ سب گا چکا تو فرمایا کہ واقعی تم اپنے کمال میں یکتا ہو مگر اسوقت شاید پرتو سے ان فقراء کے تمھارے بھی مزاج میں کچھ تغیر واقع ہوا ہوگا کہ فلاں فلاں مقام میں یہ یہ بات رہ گئی ورنہ تم کو بخوبی معلومات ہوگی، اس نے عرض کی کہ پیرو مرشد فدوی کو جو کچھ معلوم تھا سب عرض کیا، یہ جو حضرت نے فرمایا ہے اس کا علم نہیں، کچھ حضرت کی طرف سے ارشاد ہو، جب آپنے جس جس مقام میں جو جو اتار چڑھاؤ رہ گیا تھا اس کو باحسن وجہ سنایا اور سمجھایا وہ نہایت خوش ہوا اور اپنے کو سب کچھ چیز جانا،

ایک اور جگہ نواب مبارک علی خاں مؤلف کمالات عزیزی کی روایت سے جنھوں نے اپنی کتاب میں بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں:

"دو قوالوں میں ایک راگ کی تشخیص میں بڑا اختلاف تھا، آخر باتفاق ہمد گر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ راقم (نواب مبارک علی خاں) بھی اس وقت قریب موجود تھا، قوالوں کی تقریر سنکر چلا گیا، مگر وہ اپنا سوال عرض کر چکے تھے، حضرت نے ایسی کیفیت اس راگ کی بیان کی

اور اس طرح اس کو سنا دیا کہ دونوں کا اطمینان خاطر ہوا اور دونوں خوش ہو کر دعا دیتے ہوئے چلے گئے۔"

شاہ عبدالعزیز صاحب آخر عمر میں مختلف پریشان کن عوارض میں مبتلا تھے، ان کی طرف بھی مصنف نے کئی جگہ اشارہ کیا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"روایت ہے مولوی شجاعت حسین صاحب غازیپوری سلمہ اللہ تعالیٰ سے وہ روایت کرتے ہیں اپنے استاد مولوی سخاوت علی صاحب جونپوری سے، وہ شاگرد ہیں مولانا اسمٰعیل دہلوی شہید کے کہا انھوں نے کہ حضرت کو شدت حرارت قلب سے دھڑکے کا عارضہ تھا، تو کبھی کبھی شاہراہ عام میں جو روبرو دولت سرا کے تھا، عصر کے وقت واسطے تخفیف عارضہ اور تفریح طبع کے حمل قدمی کیا کرتے تھے۔"

شاہ صاحب کی یادداشت اور انکے کمالات کے سلسلے میں ایک طویل قصہ لکھنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں:-

"...... یہ ماجرا اس ایام میں تھا کہ جن روزوں حضرت بسبب قصور ہضم کے دو یا تین لقمے غذا اور اسی قدر نمک سلیمانی کھا کر چار ہزار قدم مشی فرماتے تھے۔"

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے حالات میں ایسے متعدد واقعات اور کیفیات مصنف نے بیان کیے ہیں جن کو نقل کرنے کی گنجائش اس مقالے میں نہیں ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب کے بعض تلامذہ کے تفصیلی حالات جو اب بالکل نایاب ہیں، اس تذکرے میں ملتے ہیں، خاص طور پر سید احمد شہیدؒ، شاہ اسحٰق، مولانا یعقوب اور مولانا سراج احمد خورجوی کے حالات دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں، اس مختصر سے تعارف سے ناظرین اس کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ہندی شاعری کا ایک تاریخی جائزہ

از جناب زیدی جعفر رضا صاحب شعبۂ ہندی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۹)

دور ارتقاء ہندی شاعری کی عمارت زمانۂ شرنگار کے اواخر تک آتے آتے بڑی جاذب نظر ہو گئی تھی، اس کے نقش و نگار اہل دل کو متاثر کرنے لگے تھے، لیکن یہ تاثر وقتی تھا، ہندی شاعری میں ابتک ذہنوں کو اپنی طرف مائل کرنے کی صلاحیت نہیں تھی، ادب، خواہ کسی زبان کا ہو جب تک دل و دماغ کو یکساں طور پر اپیل نہیں کرتا زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتا، اس لیے زندگی کے حقایق کی ترجمانی ادب کے لیے ضروری ہے، ادب کو زمانے کی روش اور مسائل قوم و ملت کے درد، خلوص و محبت کی چاشنی اور ماضی اور حال کی روایات کا آئینہ دار ہونا چاہیے، ہندی شاعری نے اپنے دور ارتقاء میں ان منازل کو درجہ بدرجہ طے کیا ہے، کبھی برج بھاشا کی شاعری سے اپنے رشتے جوڑتی رہی، کبھی اس نے اردو زبان کی روز افزوں مقبولیت اس کے نکھرے اور صاف ستھرے روپ کو دیکھکر خود بھی کھڑے ہونے کی کوشش کی، اور جب اس نے اپنے جسم میں کچھ توانائی محسوس کی تو اردو کی رگ حیات کو اپنے اہنسا وادی ہاتھوں سے منقطع کر دینا چاہا، اس سلسلے میں اس نے دانشمندی کا ثبوت بھی دیا، لیکن کج فہمی اور نادانی کی مثالیں زیادہ پیش کیں، ہم یہاں پر ہندی ادب کے ارتقائی دور کے ان ہی زینوں کا مطالعہ کریں گے،

پہلا زینہ - برج بھاشا کی شاعری ہندوستان میں انگریزی حکومت قائم ہونے کے بعد ملک میں جو سماجی، سیاسی اور مذہبی تبدیلیاں ہوئیں ان کی روشنی میں ادب کے دھارے کا کروٹ لینا لازمی تھا، ہندستانی

ادب نے اس بات کو محسوس کیا، انگریزی حکومت نے زمینداروں کو اور ریاستوں کو ختم نہیں کیا تھا اور ان ریاستوں سے متعلق شعرا اب بھی برج بھاشا کی پرانی دھنوں میں راگ الاپ رہے تھے، اس کے علاوہ ہندی کے بیشتر شعرا شاعری کے جدید دھارے کو دیکھنے کے باوجود ابھی برج بھاشا کا موہ ختم نہیں کر سکے تھے۔

ہندی کے قدیم شعرا نے نکھ شکھ (नख-शिख) بارہ ماسا (बारह मासा) اور نائیکا بھید (नायिका भेद) کا ڑا دقیع ادب پیش کیا تھا لیکن ہندی کے نئے دور کی آرزوئیں اور ضروریات اس سے بالکل مختلف تھے، ادب کو جدید رجحانات قبول کرنے کے لیے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے، ہندی کے شعرا جن پر انگریزیت کا مطلق اثر نہ تھا، جو خالص ہندوستانی تمدن اور تہذیب کے خواہاں تھے جنھیں اپنی دیومالاؤں سے بے پناہ عقیدت تھی، جنھیں اپنے وطن سے محبت تھی لیکن ایک ایسے وطن کی آرزو تھی جو آزاد ہو، جن میں ہندو قوم کی ترقی کے سپنے ہوں، اس لیے ان کی طبیعت ان جدید رجحانات کی طرف مائل نہ ہو سکی، انگریزی ملک کی قومی زبان بن چکی تھی، اردو کو صوبائی زبان تسلیم کیا جا چکا تھا، جدید طریقۂ تعلیم نے اردو اور انگریزی کو فروغ دیا، ہندی نے جان بوجھ کر تو نہیں لیکن غیر شعوری طور پر ان اثرات کو قبول کیا، اس سلسلے میں پنڈت کرشن شنکر شکل لکھتے ہیں:۔

"اردو ادب کے تعلق سے پہلا اثر ہماری شاعری پر یہ پڑا کہ گنبھیر دیدنا کی عکاسی کی طرف شعرا مائل ہوئے، اس کا محرک بھارتیندو جی کو سمجھنا چاہیے۔ وہ شرنگار (تعشق) کو ٹیپی ٹپائی لکیروں سے نکال کر احساسات کی سطح تک لائے۔" (آدھنک ہندی ساہتیہ۔ پنڈت کرشن شنکر شکل ص ۳۲)

انگریزی ادب کے اثر سے برج بھاشا میں قدرتی مناظر کی تصویریں پہلے کے مقابلہ میں زیادہ جاندار روپ میں سامنے آئیں، قدیم ہندی شعرا کی نگاہیں بھگوان کے مختلف روپوں اور نائیک نائیکا کے ناز و غمزوں کے گرد ہی طواف کرتی رہی تھیں، انھیں نیچر کا مطالعہ کرنے کا بہت کم موقع نصیب ہوا تھا جس کو

انگریزی ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے، ہندی شعرا میں ہریش چندر نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور پرکرت یا نیچر کو اس کے خالص روپ میں پیش کیا، ٹھاکر جگ موہن سنگھ نے آگے چل کر نیچر کے بڑے ہی خوبصورت مناظر پیش کیے، ان کی تخلیقات برج بھاشا کے لیے ایک خوبصورت تحفہ ثابت ہوئیں، بھارتیندو جی کو برج بھاشا پر قدرت حاصل تھی، ان کے زمانے میں اس زبان میں کوملتا اور حلاوت کی پہلے سے بھی زیادہ آویزش ہوئی، سری کرشن شنکر شکل لکھتے ہیں:

"آدھنک کال کی برج بھاشا کی شاعری کے بارہ میں یہ بات فخر کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ برج کا استعمال جتنا خالص روپ میں اس زمانے میں ہوا اتنا اور کسی زمانے میں نہیں ہوا تھا، بھارتیندو، رتناکر، شری دھر پاٹھک، پنڈت ستیہ نارائن کوی رتن، ویوگی ہری، رام چندر شکل، پنڈت ایودھیا سنگھ اپادھیائے وغیرہ برج کے ذی شعور پرستاروں کے ہاتھوں بھاشا کا بڑا ہی صاف ستھرا اور نکھرا ہوا روپ سامنے آیا۔" (ادھنک ہندی ساہتیہ ص ۳۶)

اس زمانے میں برج بھاشا میں لکھی جانے والی تصانیف میں ادھو شتک (उद्धव शतक) گنگا ورتن (गंगा वतरण) ، بدھ چرتر (बुद्ध चरित्र) ویر ست سئی (वीरसत सई) اور رس کلش (रस कलश) کو خاص اہمیت حاصل ہے، ان کے علاوہ بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں لیکن زیادہ تر متفرق تخلیقات پیش کی گئیں، کچھ ترجمہ بھی کیے گئے جن میں اتر رام چرتر، مالتی مادھو، رت سنہار، رگھو ونش، میگھ دوت، ادجڑ گرام، مدرا راکشس وغیرہ قابل ذکر ہیں، ذیل میں دور ارتقا کے برج بھاشا کے شعرا کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا جاتا ہے، جس سے اس زمانے کی برج بھاشا کی شاعری کا صحیح روپ سامنے آسکے گا۔ اس دور کے کچھ قابل ذکر شعرا یہ ہیں:

سیوک: سیوک کاشی کے رئیس بابو ہری شنکر کے سایۂ عاطفت میں تھے، ڈاکٹر محمد حسن نے ہری شنکر کے بجائے ہریش چندر لکھا ہے، جو غلط ہے، سیوک کے والد کا نام دھنی رام تھا، انھوں نے اپنا تعارف اس طرح کرایا ہے:

شری رش ناتھ کو ہوں میں پناتی ، ونا تی ہوں شری کوی ٹھاکر گیرد
شری دھنی رام کو پوت میں سیوک سنکر کو گھو سبندھو جیوں چیرو
مان کو باپ بیا کسیا کو چچا مرلی دھر کرشن ہوں ہیرو
اسنی میں گھر کا سکا ہیں ہری سنکر بھوپت دکھچک میرو

نائیکا بھید پران کا گرنتھ واگ ولاس (वाग्विलास) مشہور ہے ، اس کے علاوہ بروے چھند میں ان کا نکھ شکھ گرنتھ بھی ہے ، جو غیر مطبوعہ ہے ، ان کا زمانہ سمبت ۱۸۷۲ء سے ۱۹۳۸ء تک کا ہے ، انھیں برج بھاشا پر پورا عبور حاصل تھا ،

مہاراجہ رگھوراج سنگھ یہ ریواں ریاست کے راجہ تھے ، رام کی بھگتی میں ڈوبی ہوئی انکی تخلیقات قابل قدر ہیں ، ان کی تصانیف میں رام سوئمبر ، رکمنی پریتے ، آنند امبو ندھ ، رامانشیام وغیرہ مشہور ہیں ، نمونۂ کلام یہ ہے :-

ڈرت ہتو جو بھون پریت پرچھاہیں جان تاڈکا بھنگری کرن بدھ ماریو ہے
جات جو سہم سنی راچھس کہانی کان منی لکھ راکھ سوناچر سہار یو ہے
پھٹک پھرس کھیلے کبھوں نہ نار کٹ ہی گوتم کی گھینی سو سلاتے تاریو ہے
بھنے رگھوراج ساچ بھاکھو ترھوت دوت بھوت پت دھن پیر تو توڑ داریو ہے

سردار سردار کا زمانۂ شاعری سمبت ۱۹۰۲ء سے ۱۹۴۰ء تک مانا جاتا ہے ، یہ کاشی کے راجہ ایشوری پرشاد نارائن سنگھ کے دامن دولت سے وابستہ تھے ، مصر بندھوؤں نے انھیں پدماکر کے درجہ میں رکھا ہے ، ان کی تصانیف میں ویّنگ ولاس ، شٹ رت ، ہنومت بھوشن ، تلسی بھوشن ، شرنگار سنگرہ ، رام رتناکر ، ساہتیہ سدھاکر ، رام لیلا پرکاش وغیرہ مشہور ہیں ، نمونۂ کلام یہ ہے :

پرپورن پریم میں پاگ سواپت جام بتی ورت پالتی ہیں
لس باس دھیان دھرے تنکو من کے تن نیک نہ ہاتی ہیں

سردار بنا ہن ہارو ہی ہم کون کلا لکھ لالتی ہیں ۱
نندی یہ تہاری سدا ابتیاں نٹ سال لوں حب ھنا سالتی ہیں ۱۱

کیشو داس کی کوی پریا اور رسک پریا ، بہاری لعل کی ست سئی سور کے درشٹ کوٹ وغیرہ پر سردار کی شرحیں مشہور ہیں ، شرنگار سنگرہ ، سندری تلک ، ساہتیہ رتناکر اور ساہتیہ پربھاکر وغیرہ میں ان کے کبت پائے جاتے ہیں۔

بابو رگھوناتھ داس یہ ایودھیا کے مہنت تھے ، انھوں نے سمبت ۱۹۱۱ء میں وشرام ساگر ، نام سے دوہا اور چوپائی میں ایک ضخیم کتاب نظم کی ، مگر یہ تصنیف معمولی درجہ کی سمجھی جاتی ہے ، بھاشا کے بارے میں ان کا خیال ہے :

سنسکرت پراکرت بھارسی بیدھ ویس کے ایں
بھاشا نا کو کہت کوی تتھا کینھ میں چین

للت کشوری اور للت مادھری یہ دونوں بھائی لکھنؤ کے بنیے تھے ، جو ورنداون میں بس گئے تھے ، ان کا زمانۂ شاعری سمبت ۱۹۱۳ء سے ۱۹۳۰ء تک مانا جاتا ہے ۔ ان کی شاعری میں زیادہ تر گوپیوں اور کرشن سے متعلق تاثرات ہیں ، انھیں اردو سے بھی لگاؤ تھا ، ان کی غزلیں بھی ہیں۔

راجہ لکشمن سنگھ انھوں نے کالی داس کی شکنتلا ، میگھ دوت اور رگھو ونش کے ہندی ترجمے بھی کیے ہیں ، ان ترجموں پر اصل کا گمان ہوتا ہے ، شکنتلا کے ترجمہ کا ایک نمونہ یہ ہے :

ہمانسو چندا سوں کسم سر توسوں کہت کیوں ۱
نہیں سانچے دواو ان گنن موں سے جنن کوں ۱۱
کھری چھوڑے جوالاوہ کرن بالا سنگ دھری ۱
تو ہو وجر کاری نج سمن کو بان کرمی ۱۱

لچھمی رام بھٹ ان کی پیدائش اموڑھا ضلع بستی میں ہوئی تھی، عرصہ تک ایودھیا کے راجہ کے زیر سرپرستی رہے، ان کی تصانیف میں مان سنگھاشٹک، پرتاپ رتناکر، راونیشور کلپ ترو اور کملانند کلپ ترو ہیں، انھوں نے عربی اور فارسی کے سلیس لفظوں کا حسب ضرورت استعمال کیا ہے، بھاشا میں ان کا تخلص لچھمی رام ہی تھا، ان کا سنہ پیدائش سمبت ۱۸۹۸ بتایا جاتا ہے۔

بینی دوج ان کی پیدائش سمبت ۱۹۰۰ میں ہوئی، یہ معمولی درجہ کے شاعر تھے، بھاشا میں ان کے دو چار سوچھند بتائے جاتے ہیں، لیکن ان کی کوئی تصنیف ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے، ان کی رچناؤں کا موضوع شرنگار ہے۔

گووند گلا بھائی یہ گجرات کے باشندے تھے، پیدائش سمبت ۱۹۰۵ میں ہوئی، برج بھاشا پر عبور تھا، ان کی تصانیف میں نیت ونود، شرنگار سروجنی، شٹ رتو، پاوس پیونِدھ، سمسیا پورتی پردیپ، وکروکتی ونود، شلیش چندرکا وغیرہ کے نام لیے جاتے ہیں۔

ہنومان یہ مشہور شاعر من دیو بندی جن کے بیٹے تھے، یہ لحن سے اشعار پڑھتے تھے، جس سے خوش ہو کر ہریش چندر جی نے انھیں ایک قیمتی دوشالہ اور ایک ہیرے کے نگ کی انگوٹھی انعام دی تھی، ان کی کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا، سمبت ۱۹۳۶ میں کاشی میں موجود تھے۔

بابو ہریش چندر بابو بھارتیندو ہریش چندر کی پیدائش ایک وشنو خاندان میں ہوئی تھی، ان کے والد کا شمار اپنے دور کے اچھے شعرا میں تھا، بھارتیندو جی نے بچپن ہی سے شاعری شروع کر دی تھی، اردو اور فارسی سے بھی اچھی واقفیت رکھتے تھے، ابتدائی زمانے میں اردو اشعار بھی موزوں کرتے تھے، اور رسا تخلص کرتے تھے، لیکن بعد میں انھیں کھڑی بولی ہندی میں تجربہ کرنے کا شوق پیدا ہوا، اس میں ان کو کامیابی ہوئی، اور اردو کے مقابلہ میں کھڑی بولی ہندی میں شاعری کا

ذوق دن بدن بڑھتا گیا، ہریش چندر جی کو اگر بابائے ہندی (کھڑی بولی) کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، برج بھاشا کی شاعری انھوں نے ورثے میں پائی تھی، ان کے ابتدائی زمانے کے کلام ہی سے ان کا مستقبل جھلکنے لگا تھا، ان کا یہ پہلا چھند پڑھنے کے قابل ہے،

ہم تو مول لیے یا گھر کے
داس داس شری وتبھ کل کے چاکر رادھا ور کے
ماتا شری رادھکا پتا ہر بندھ داس گن کر کے
ہری چند تمھرے ہی کہاوت نہہ بدھ کے نہہ ہر کے

ہریش چندر جی کے بارے میں ڈاکٹر لکشمی ساگر وارشنے کا یہ قول ہے کہ

"بھارتیندو ہریش چندر ایک عظیم ادبی سنگم کی حیثیت رکھتے ہیں جہاں ادب کی قدیم دھارائیں مل کر ایک جدید ادبی دھارے کو جنم دیتی ہیں، ان میں جگ نک، کبیر، سور، میرا، دیو اور بہاری وغیرہ سبھی سمٹ کر آگئے ہیں۔" (آدھنک ہندی ساہتیہ ص ۳۳۱)

بھارتیندو جی نے برج بھاشا کی شاعری کو زمانے کے مسائل سے روشناس کرایا، حب الوطنی کے جذبہ نے ان کی شاعری میں چار چاند لگائے، ہند و مذہب اور ہندو قوم کو زندہ اور بیدار کرنے کے لیے انھوں نے اپنی ساری زندگی وقف کر دی، اس کے لیے انھوں نے تاریخ کے اوراق بھی الٹے، وہ کہتے ہیں کہ اے قوم پرتھوی راج اور جے چند کی لغزشوں کے نتیجہ میں یون ہندوستان میں آئے تیمور لنگ اور چنگیز وغیرہ نے آکر قتل عام کیا، علاء الدین اور اورنگ زیب نے مل کر تمھارے مذہب پر ضرب کاری لگائی اور محمد شاہ رنگیلے نے تمھیں عیش و سرور کے غار میں ڈھکیل دیا، تم اس وقت تک بہت سو چکے، کسی طرح تمھاری آنکھیں نہیں کھلیں، اب تو ہندوستان میں ملکہ وکٹوریہ حکومت کر رہی ہے، اے لاڈلو! اب خوفزدہ کیوں ہو اب تو جاگ جاؤ۔

پرتھی راج جے چند کلہ کری یوں بلا یو
تمرلنگ چنگیج آد ہو نرن کٹا یو
الادین اورنگجیب ل دھرم نسا یو
بشے باسنا وسہہ محمد سا پھیلا یو
تب لوں ہو سوے وتس تم جاگے نہہ کو ادھتن
اب تورانی وکٹوریہ جاگہو ست بھے چھار من

انھی انگریزوں کی حکومت میں اور تو سبھی سکھ کی چیزیں نظر آتی ہیں لیکن اس بات کا بیحد غم ہے کہ ملک کی دولت غیر ملک میں برابر بھیجی جارہی ہے ؎

انگریج راج سکھ ساج سبھے سب بھاری
پے دھن ودیس چل جات یہے ات کھاری

بھارتیندو کی نگاہ ہندو سماج کی کمزوریوں کی طرف بھی گئی، وہ اس میں سدھار کی ضرورت سمجھتے تھے، انھوں نے پنڈتوں کو اس زوال کا ذمہ دار ٹھہرایا، ان کا کہنا ہے کہ تم نے پرانوں میں اپنی طرف سے جعلی گڑھ گڑھ کر داخل کردیے اور مذہب کو شو، ساکت اور وشنو وغیرہ مختلف مسلکوں میں تقسیم کردیا، بیوہ کو شادی کے حق سے محروم کرکے سماج میں عیاشی کو فروغ دیا، غیر ممالک میں جانے کی ممانعت کرکے قوم کو بالکل کوپ منڈوپ بنادیا، ہزاروں دیوی دیوتاؤں اور بھوت پریت کی پوجا کراکے ہندو قوم کے ایشور سے منہ موڑ لینے کے سامان مہیا کردیے ؎

رچ بہو بدھ کے واکیہ پرانن مانہہ گھسائے
سیو، ساکت وشنوانیک مت پرگٹ چلائے
بدھوا بیاہ نشیدھ کیو ببھچار پرچار یو
روک ولایت گمن کوپ منڈوک بنا یو

اورن کو سنسرگ چھڑائی پرچار گھٹا یو
بہو دیوی دیوتا بھوت پریت آد پجا ئی
ایشور سوں سب بمکھ کیے ہندن گھبرائی

برج بھاشا کے قدیم شعرا کی طرح کرشن پریم میں ان پر بھی وہ وجدانی کیفیت طاری ہوجاتی ہے جو سور اور میرا کا حصہ تھی کسی سے صحیح معنوں میں محبت ہوجانے کے بعد اسے کتنا ہی چھپانا چاہو وہ نہیں چھپ سکتی، آنکھیں اس راز کا انکشاف کرہی دیتی ہیں ؎

چھپائے چھپت نہ نین لگے
اُدھر پریت سب جان جات ہیں گھونگھٹ میں نہ کھگے
کتنو کرو دراؤ درت نہیں جب یہ پریم پگے
نڈر بھئے ادھر سے ڈولت موہن رنگ رنگے

بھارتیندو جی نے کئی ادبی انجمنیں قائم کی تھیں، جن میں اکثر طرحی نشستیں ہوتی تھیں، ان ہی نے شرنگار سے متعلق بڑے ہی دلکش کبت اور سوئے نظم کیے ہیں، جو فحاشی سے بالکل پاک ہیں، پریم مادھری (۱۸۷۵ء) پریم ترنگ (۱۸۷۷ء) پریم پرلاپ (۱۸۷۷ء) پریم پھلواری (۱۸۸۳ء) وغیرہ میں ان کے خوبصورت اور پرمعنی کبتوں، سویوں اور پدوں کا انتخاب ہے، بھارتیندو گرنتھاولی (مرتبہ ناگری پرچارنی سبھا کاشی) میں بھی ان کے منظومات کے اچھے نمونے ملتے ہیں، بھارتیندو جی کی زبان صاف اور نکھری ہوئی ہے، اس میں اغلاط بہت کم ہیں، ان کے رسیلے سویوں میں بول چال کی برج بھاشا کی جھلک ہے، زبان سلیس، شیریں اور حلاوت انگیز ہے،

برج چند یہ ہریش چندر کے ہمعصر تھے، ان کی کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا، متفرق کبت اور سوئے پائے جاتے ہیں، جن کی روشنی میں انھیں ایک باصلاحیت شاعر تسلیم کیا جاسکتا ہے، زبان

ان کی بھی صاف ستھری تھی، انکی بیشتر تخلیقات میں ہرلش چندر کا دھوکا ہوتا ہے۔

پنڈت وجیانند یہ برج بھاشا کے اچھے شاعر تھے، ان کی مدد سے ورما جی نے بھارت جیون اخبار نکالا تھا جس میں بہت دنوں تک ان کا ایک چھپے، روزانہ شائع ہوتا تھا، انھوں نے کالیداس کے میگھ دوت کا منظوم ترجمہ بھی کیا تھا، اور کسی گرنتھ کا پتہ نہیں چلتا۔

پنڈت امبکادت بیاس سنسکرت کے اچھے عالم تھے نظمیں اکثر فی البدیہہ کہتے تھے، ۲۴ منٹ میں سو شلوک نظم کر لیتے تھے، اس زود گوئی کی بنا پر انھیں گھٹکا شتک کا خطاب ملا تھا، سنسکرت میں انکی کئی تصانیف ہیں، ہندی میں ان کی شہرت "بہاری بہار" کی وجہ سے ہے، اس میں انھوں نے بہاری کے دوہوں پر کنڈلیاں بنائی تھیں، ان کا زمانہ سمبت ۱۹۱۵-۵۷ سنہ کا ہے۔

نونیت لعل چترویدی یہ خطۂ برج کے باشندے تھے، بھکتی رس سے متعلق ان کی منظومات کے خوبصورت نمونے ملتے ہیں، ان کی زبان میں مٹھاس اور روانی ہے، رتناکر جی ان کے شاگرد تھے، ان کا زمانۂ شاعری سمبت ۱۹۱۵ سنہ سے ۱۹۸۹ سنہ تک کا ہے۔

رادھا کرشن داس بھارتیندو ہرلش چندر کے پھوپھی زاد بھائی تھے، پیدائش سمبت ۱۹۲۲ سنہ میں ہوئی رحیم کے دوہوں پر ان کی کنڈلیاں بہت مشہور ہیں، نظم کا موضوع بھکتی اور شرنگار ہیں، ان کے کلام کا انتخاب بابو شیام سندر داس نے "رادھا کرشن گرنتھاولی" کے نام سے شائع کرایا تھا، ان کے سویوں میں پوری روانی پائی جاتی ہے، نمونۂ کلام یہ ہے ؎

موہن کی یہ موہنی مورت جیہ سے بھولت ناہیں بھلائے
چھوڑن چاہت نیہ کو ناتو کو اُدھ چھوٹت ناہیں چھڑائے
داس جو چھوڑ کے پیائے بہا ہیں اور کے نپ پے جاتی لبھائے
بھول سکے اب کون جیا ان تو ہنس کے پہلے ہی جرائے

پنڈت پرتاپ نارائن مصر نثر نگار کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں، اکثر برج بھاشا میں بھی اشعار موزوں کرتے تھے، بھارتیندو ہرلش چندر سے کافی متاثر تھے، زمانۂ شاعری سمبت ۱۹۱۳ سنہ سے ۱۹۵۱ سنہ تک مانا جاتا ہے، "برہمن" نام سے اخبار کا اجرا کیا تھا جس کے اشتہار تک کبھی کبھی منظوم ہوا کرتے تھے، ان کی زبان پر مغربی اودھی کا اثر بھی پایا جاتا ہے، انھیں بھی ہرلش چندر کی طرح ہندی ہندو اور ہندوستان کی دھن تھی،

چہو جو سانچو نج کلیان تو سب مل بھارت سنتان
جپو نرنتر ایک جبان ہندی ہندو ہندوستان
تب ہی سدھر ہیں جنم ندان تب ہی بھلو کر ہیں بھگوان
جب رہ ہے نس دن یہ دھیان ہندی، ہندو، ہندوستان

پریم گھن ان کا اصلی نام بدری نارائن اپادھیائے تھا، ہندی میں پریم گھن تخلص تھا، اردو میں بھی کہتے تھے، بلکہ بھارتیندو جی سے ملنے سے پہلے زیادہ تر اردو ہی میں لکھا کرتے تھے، اردو میں غالباً ابر تخلص تھا، بھارتیندو جی سے متاثر ہو کر محض ہندی کے لیے اپنے کو وقف کر دیا، ماہنامہ آنند کادمبنی اور ہفتہ وار ناگری نیرد جیسے پرچوں کا اجرا کیا، اپنے زمانے کے مسائل کو ہی اپنا موضوع بنایا، کبھی ہندی کے جائز حق کے لیے آواز بلند کی اور کبھی ہندوستان کی قابل رحم حالت پر آنسو بہائے زمانہ سمبت ۱۹۱۲ سنہ سے ۱۹۸۰ سنہ تک کا مانا جاتا ہے۔

جگ موہن سنگھ برج بھاشا کے ایک اچھے شاعر تھے، زمانۂ شاعری سمبت ۱۹۱۴ سنہ سے ۱۹۵۵ سنہ کے درمیان تسلیم کیا جاتا ہے، زبان سلیس، رواں اور شستہ تھی، قدرتی مناظر کے خوبصورت مرقعے انکے یہاں کثرت سے پائے جاتے ہیں، صنائع پر کوئی خاص توجہ نہیں تھی، اکثر منظومات "شیاما سوپن" میں ملتے ہیں اس کے علاوہ کچھ منتخب کلام شیام لتا اور پریم سمپت لتا میں بھی پایا جاتا ہے، نمونۂ کلام یہ ہے:

کل کان تجی گرو لوگن میں بس کے سب بین کو بین سہا
پرلوک نسائی بسے بدھ سوں ان مت کو مارگ جان کہا
جگ موہن دھوتی حارج باھن یاتن پالیوہے پریم ہما
سب چھوڑ تھیں ہم بابرا ہو تم چھوڑ ہیں کہو پایو کہا

لالہ سیتارام | پیدائش سمبت ۱۹۱۵ء میں ہوئی، انگریزی اور سنسکرت زبانوں پر اچھی نظر تھی، رگھوونش کمار سنبھو اور میگھ دوت کے ترجمے انھوں نے بڑی کامیابی سے کیے ہیں، برج بھاشا پر قدرت تھی منظومات میں سنسکرت کے الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں، وفات سمبت ۱۹۹۳ء میں ہوئی،

ہری اودھ | اصل نام ایودھیا سنگھ اپادھیایہ تھا، پیدائش سمبت ۱۹۲۲ء میں ہوئی، کھڑی بولی ہندی کے شاعر کی حیثیت سے زیادہ مقبول ہوئے، ابتدا برج بھاشا کی شاعری سے ہوئی لیکن بعد میں وقت کے دھارے کے ساتھ بہنا پڑا اور کھڑی بولی میں پریہ پرواس لکھ کر امر ہو گئے، وطن نظام آباد ضلع اعظم گڈھ تھا، وہاں سکھوں کے مہنت بابا سمیر سنگھ بہت اچھا ادبی ذوق رکھتے تھے، انھوں نے کئی ایک ادبی انجمنیں قائم کر رکھی تھیں، ہری اس میں نظمیں پڑھا کرتے تھے، ہری اودھ تخلص اسی زمانے کا ہے، انھوں نے برج بھاشا میں پوربی الفاظ بھی استعمال کیے ہیں، برج بھاشا میں ان رس کلس گرنتھ قابل قدر ہے، اور رسوں کے مطالعہ کے لیے اچھی کتاب ہے، انھوں نے قدیم نائکاؤں کے ساتھ پرلواد پریکا، دیش پریکا، بجنا نراگنی، لوک سیویکا، اور دھرم پریمکا وغیرہ جدید نائکاؤں کے نام بھی گنائے ہیں، لیکن یہ نہیں بتایا ہے یہ نائکائیں کس رس کے ذیل میں آتی ہیں، اپنے زمانے کے دوسرے شعرا کی طرح ان میں بھی مذہب اور قوم کی محبت کا جذبہ تھا، نمونۂ کلام یہ ہے ؎

چھن چھن چھبت نہ دکھینہ سماج تن، ہیر نہ نہ دھوا چھوک ہو چھتیان
جات کو تن الوک ہیں نہ آگل ہوئے، بھول نالیو کنہ کلنکی ہوت کل مان"

"ہر اودھ" چھینت لکھینہ نا سلونے لعل، للٹت نہار ہیں نہ لونی لونی للنان ا
کھولے کچھ کھلیں پے کہاں ہیں ٹھیک ٹھیک کھلیں ادھ کھلی اجوں ہیں ہماری کلی انکھیان"

شری دھر پاٹھک | ان کا شمار کھڑی بولی کے ابتدائی زمانے کے عظیم شعرا میں ہوتا ہے لیکن یہ برج کے بڑے پرستار تھے، انھوں نے انگریزی ادب کا بھی مطالعہ اور اس سے بڑا استفادہ کیا تھا، یہ ادب کو زندگی کی تنقید سمجھتے تھے، حیوانات اور نباتات بھی ان کی منظومات کے موضوع ہیں، لیکن انکی خاص توجہ نوع بشر کے لیے تھی، قدرتی مناظر میں ہمالیہ، کشمیر اور مختلف موسموں کے بیانات، دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں، اردو کی زبان سے انھیں بے پناہ محبت تھی، ایک مقام پر لکھتے ہیں ؎

نج بھاشا بولہو لکھو پڑھو گنہو سب لوگ　　کرہو سکل بشین بشین نج بھاشا ابیوگ

انھوں نے برج بھاشا میں سنسکرت سے رت سنگھار اور انگریزی سے ڈیزرٹڈ ولیج (Deserted village) کے ترجمے کیے جس سے ان کی قابلیت کا سکہ جم گیا، ہندوستان کے تمام اخباروں نے ان کی تعریف شائع کی، اس ترجمہ کا ایک نمونہ یہ ہے ؎

As sometall cliff, that lifts its awful from ;
Swells from the vale, and midway leaves the storm
Though round its breast The rolling clouds are spread
Eternal sunshine settles on its head,

(ترجمہ) جم کو اُپر دُت تُنگ تُنگ دیر گھ تن ٹھاڑو
اٹھیو گھڈ سوں رتھے بوند ریچ ہی چھاڑو
یدپ تاس دکھشتل دل بادل کو لاہل
بھال براجے سدا بھان ابھادت اُجّل

ان کا زمانہ سمبت ۱۹۱۶ سے ۱۹۸۵ تک کا مانا جاتا ہے، ترجمہ کے علاوہ ان کے بہت سے متفرق چھند ملتے ہیں۔

رتناکر اصل نام جگناتھ داس اور رتناکر تخلص تھا، دوسرے شعرا کے ساتھ یہ کھڑی بولی کے تیز و تند دھارے میں نہیں بہہ سکے، بلکہ کھڑی بولی کے تھپیڑوں میں برج بھاشا کی پرورش کی۔ اس زبان سے انھیں بڑی محبت تھی، طویل عرصہ تک شاعری کی، زیادہ کہنے کے قائل نہیں تھے، دیگر زبانوں پر بھی اچھی نگاہ تھی، خصوصاً فارسی اور انگریزی پر پوری قدرت تھی، انگریزی ادب سے متاثر ہوکر برج بھاشا کی شاعری میں استعاروں کو جگہ دی، اور اس کو ایک جدید طرز بیان بخشا، اردو زبان کے شیریں اور دلکش محاوروں کی طرف دوسرے شعرا کی نگاہ نہیں گئی، لیکن رتناکر جی نے اس سے استفادہ کیا اور اپنی زبان کو با محاورہ بناکر اس میں اور بھی زور پیدا کر دیا، ان کی زبان کا ایک نمونہ یہ ہے:

جوگن کی بھوگن کی بکل بیوگن کی جگ میں نہ جاگتی جمعتیں رہ جائیں گی
کہے رتناکر نہ سکھ کے رہے جو دن تو یہ دکھ دوند کی نہ راتیں رہ جائیں گی
پریم نیم چھاڑ گیان چھیم جو بتاوت سو بھیت ہی نہیں کہا چھاتیں رہ جائنگی
گھاتیں رہ جائیں گی نہ کانھ کی کرپاتیں اِت ادھو کہہ بے کو بس باتیں رہ جائنگی

رتناکر جی نے کابیہ سمبندھنی کے نام سے ایک ماہنامہ کا بھی اجرا کیا تھا، ان کے بارے میں پنڈت رام چندر شکل کے خیالات یہ ہیں: "انکی شاعری بڑے بڑے قدیم شعرا کے ٹکر کی ہے، ان قدیم شعرا میں بھی ان کی سی سوجھ بوجھ بہت کم میں پائی جاتی ہے، ان کی زبان بھی اپنے پیش رو شعرا کے مقابلہ میں زیادہ چست اور گٹھی ہوئی ہوتی ہے، یہ ادب اور برج بھاشا کابیہ کے جید عالم تسلیم کیے جاتے تھے،"

(ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۵۴۷)

رتناکر جی کی تصانیف میں ہرشچندر، گنگا وترن اور ادھوشتک بہت مقبول ہیں، انکے علاوہ انھوں نے انگریزی شاعر پوپ کے ایسے آن کریٹی سزم (Essay on criticism) کا رولا چھند میں بہت اچھا ترجمہ کیا تھا، ان کے متفرق کبت اور سوئے بے شمار ہیں، ان کا مجموعہ کلام "رتناکر" کے نام سے ناگری پرچارنی سبھا کاشی سے شائع ہوا ہے، گنگا وترن میں انھوں نے گنگا کے نزول کی داستان نہایت تاثر انگیز پیرائے میں بیان کی ہے، اسی طرح ادھوشتک میں گوپیوں کے دل کی دھڑکنوں کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، سگن بھگتی کی تحریک میں جو اب بہت پرانی ہو چکی ہے، ادھوشتک نے تھوڑے وقفے کے لیے جان ڈال دی، گوپیوں کی کرشن کی محبت میں ڈوبی ہوئی تصاویر کا اتنا حسین البم برج بھاشا کی شاعری کے چند ہی شعرا نے پیش کیا ہے، رتناکر جی کا نمونۂ کلام یہ ہے ؎

دھر راکھو گیان گن گورو گمان گوئی گوپن کو آوت نہ بھاوت بھڑنگ ہے،
کہے رتناکر کرت ٹائیں ٹائیں در تھا سنت نہ کو ادہیاں یہ منھ جنگ ہے،
اودھو اوپا یہ کیسے سہج سڈھنگ ادھو سانس رکیے کو کہا جوگ ہی کڈھنگ ہے
کٹل کڑاری ہیر اٹاری ہے آتنگ اَنی جمنا ترنگ ہو تہاروست سنگ ہے۔

رائے دیوی پرساد پورن ان کی پیدائش سمبت ۱۹۳۰ میں کانپور میں ہوئی تھی، برج بھاشا کے اچھے شاعر تھے، طبیعت میں قدامت پسندی تھی، لیکن اس کے باوجود جدید رجحانات سے غافل نہیں تھے، ان کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک پرانے طرز کی، دوسری نئے طرز کی، پہلے طرز کی منظومات میں شرنگار، بھگتی، ویدانت اور ریتُ ورنن ہیں، اور دوسرے طرز کا کویتاؤں میں حب الوطنی سے متعلق منظومات، ان کی زبان خالص برج بھاشا ہے، الفاظ کے انتخاب میں انھوں نے اپنے کومل اور معصوم دل کو پیش نظر رکھا ہے، ان کی تشبیہات میں ان کے ذاتی تاثرات کو بڑا دخل ہے،

عشقیہ گیت بہت کم لکھے ہیں، ان کا مزاج غالباً اس طرح کی شاعری کو پسند نہیں کرتا تھا، قدرتی مناظر کی عکاسی میں مقابلۃً زیادہ کامیاب ہیں، کالیداس کے میگھ دوت کا ترجمہ بھی انھوں نے کیا تھا، اسکے علاوہ چندر کلا بھان کمار کے نام سے ان کا ایک ناٹک بھی مشہور ہے، نمونۂ کلام یہ ہے:

کیدھوں اٹکے ہو سبری کے بیر جا کھن میں کیدھوں بھکت نرسی کی ہنڈی کے سکارن میں
جوٹے ہو اجامل کے گنکے ادھارن میں کیدھوں گوتم کی انگنا کو تارن میں
کیدھوں شرم کرت ہنت کھرد وکھن کو لاگے کنبھ کرن کیدھوں راونے سنگھارن میں
پتت ادھارن ! ھاکر ناجابدھ ناتھ بارکیوں لگائی میری بپت بدارن میں

رام چندر شکل نقاد کی حیثیت سے ہندی میں بحید مقبول ہیں، برج بھاشا کے اچھے شاعر تھے، بدھ چرت کے نام سے لائٹ آف ایشیا (Light of Asia) کے طرز پر ایک پربندھ کاویہ لکھا، طبیعت بہت حساس پائی تھی، دوسروں کے دکھ درد پر تڑپ جاتے تھے، ہندی ادب کی ضخیم تاریخ لکھ کر انھوں نے ادب کی ناقابل فراموش خدمت کی ہے، نمونۂ کلام یہ ہے:-

کنچن کی دیوٹ پے دیپک سگندھ بھرے جگمگ ہوت بھون بھیتر اجاس کر
ابھا رنگ رنگ کی دکھائی رہیں تا سوں مل کرن مینک کی جھر وکن سوں ڈھر ڈھر
جا ہیں ہیر نو تین کی نکھری نکائی انگ انگن کے دس گئے ہیں کہوں نیک ٹر
اٹھت ادو ج ہیں اساس سوں بار بار مرک پرے ہیں ہاتھ نیچے کہوں ڈھیلے پر

ستیہ نارائن کوی رتن خطۂ برج کے باشندہ تھے، کرشن سے بے پناہ عقیدت تھی، بیشتر کویتائیں بھکتی رس میں ڈوبی ہوئی ہیں، کویتا پڑھنے کا انداز بڑا پر اثر تھا، بھو بھوتی کے دو مشہور سنسکرت ڈراموں کا جن کے نام اُتر رام چرت اور مالتی مادھو ہیں انھوں نے ترجمہ بھی کیا ہے، زمانۂ شاعری ۱۹۲۴ء سے ۱۹۷۵ء تک مانا جاتا ہے، نمونۂ کلام یہ ہے ۔

سنتن شیل کو اودیدنا جا رت سکل شریر
اندر یہ گراہک گن ہرت موہ مہابے پیر

اکنٹھت چھن چھن پرم اپھنت کو انند سمان
جبرت ہر دے تو او بست واپیا ری میں پران

بجنیش قدیم برج بھاشا کے شاعر ہیں، کھڑی بولی میں بھی اشعار موزوں کر لیتے تھے، عشقیہ شاعری میں خاص طور سے کمال حاصل تھا، نمونۂ کلام یہ ہے:-

ہائے ہائے آن کے پرائے گیو پیارے کہاں بھاگی تج گیہہ نہہ دیہہ کی سُرت ہے
کھوجے کھوجے کھرک دھرک کل دھاریں نہیں کنج بن کون کچھار ن بھرمت ہے
بوجھے تر بلین ادو جھے مرگ بر ندن سوں جبت کو ڈلت پات تت ہی کو گت ہے
ٹیرت مراری جو نکت ہیرت کھرک مُن چھاہ سوں سُمت گرد ت ہنت ہے

دیوگی ہر یہ برج بھاشا کے شعرا کی آخری کڑی ہے، طبیعت میں بھکتی کوٹ کوٹ کر بھری ہے، زمانۂ بندگی کے شعرا کی طرح ان کے کلام میں بھی جذبات اور محسوسات کو بڑا دخل ہے، لیکن یہ دنیا کو بالکل نظر انداز کر کے عبادت کے قائل نہیں، ان کا بھگوان تو گھٹ گھٹ میں موجود ہے، یہ اسے صرف اصنام میں دیکھنا نہیں جانتے، وشنو کی جیسی کٹرتا بھی ان میں نہیں پائی جاتی، اچھوت سدھار کی تحریک میں پیش پیش تھے، ان کی عشقیہ نظمیں بھی بہت دلکش ہیں، وہ عشق حقیقی کی شراب سے مدہوش تھے، ان کو اس ذات بے ہمتا سے عشق تھا جو ظاہری آنکھوں کی دید سے ماورا ہے، ان کے نزدیک وہی ستیہ اور وہی جیون ہے،

دیوگی ہر جی کی شاعری میں بید رس کی بھی خوبصورت مثالیں ملتی ہیں، سنسکرت آچاریوں کی طرح ویر رس کو انھوں نے بھی دان ویر، دھرم ویر، دیا ویر اور یدھ ویر چار قسموں میں تقسیم کیا ہے، لیکن ان کی زبان میں وہ صفائی نہیں پائی جاتی جو رتنا کر جی کے یہاں ہے، انھوں نے اکثر اوقات برج کے ساتھ کھڑی بولی کو بھی ملا دیا ہے، النکاروں کی طرف انکی توجہ نہیں تھی،

ان کی تصنیف ویرست سئی پر ہندی ساہتیہ سمیلن نے ۱۲۰۰ روپیے کا انعام دیا تھا، نمونۂ کلام یہ ہے

پران پریا کو سیس لے پرم پریم اُبھار
چلیو ہلس رن ست ہوے چوڑاوت سردار

ماتھ رہلو داناد ہو تجیں نہ ستیہ اکال
کہت کہت ہی چن گئے دھن گرد گووند لال

یہاں تک ہم نے برج بھاشا کے ان شعرا کا ذکر کیا ہے جنھیں اس دور میں ایک خاص مقام حاصل تھا، ان کے علاوہ بھی کھڑی بولی کے سیکڑوں ایسے شعراء تھے جو کبھی کبھی برج بھاشا میں بھی اشعار موزوں کرتے تھے، ایسے شعرا کا ذکر کھڑی بولی کے شاعروں کے ساتھ ہی کیا جائیگا،

اس دور میں خالص برج بھاشا کے دو اچھے مسلمان شعراء بھی گذرے ہیں، جن کے نام سید امیر علی اور غلام محمد خاں واصل بلگرامی ہیں، یہ دونوں ہی بہت اچھے شاعر تھے، پہلے کا تعلق بھکتی سے اور دوسرے کا شرنگار سے تھا، غلام محمد خاں فارسی کے بھی اچھے عالم تھے، ان کی ایک نادر کتاب مفتاح الہندی راقم الحروف کے پاس موجود ہے، جس میں انھوں نے برج بھاشا کے قواعد لکھے ہیں،

(باقی)

ٹونک کے کتب خانے
اور
ان کے نوادر

از

جناب صاحبزادہ شوکت علی خاں ایم اے ناظم ادارۂ تحقیقات علوم شرقیہ ٹونک

ٹونک آج گو علم و فن کا مرکز نہیں لیکن کسی زمانہ میں وہ گہوارۂ علم و ہنر اور کاشانۂ مذہب و ملت رہ چکا ہے، ہندوستان بھر کے منتخب اور اکابر علماء یہاں جمع تھے، سمرقند و بخارا، کابل و قندھار ایران و ترکستان اور مصر و عرب تک کے طلبا، حصول علم کے لیے یہاں آتے تھے، اس کا ذرہ ذرہ علم پروری اور ادب نوازی کا آئینہ دار ہے، یہاں محمود غزنوی کی فوجیں بھی ٹھہری ہیں، اورنگزیب کے رایات ظفر آیات بھی گذرے ہیں، ٹلکھرا اور سندھیا کے ناقوسوں کی آوازیں بھی یہاں کے دشت و جبل میں گونجی ہیں، یہیں سید احمد شہیدؒ کا قافلہ ٹھہرا تھا، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی قدمبوسی کا شرف بھی اسی زمین کو حاصل ہے، اس کی سرزمین پر اب تک ان کے فیضان اور روحانی تجلیات کا اثر باقی ہے، یہاں کے علماء و فضلا، سید حیدر علی، سید حکیم دائم علی، علی احمد بہاری، سید انعام اللہ بریلوی، حکیم امام الدین، حکیم مرزا جان خاں، حیدر حسن خاں محدث، غازی ولی محمد پھلتی، مولوی خیر الدین شیرکوٹی، مولانا نجف علی خاں جھجری، حکیم نازش خیرآبادی، محمود حسن خاں (مصنف معجم المصنفین) حکیم برکات احمد اور حافظ محمود خاں صاحب شیرانی کے فیض سے ایک عالم سیراب ہوا،

ٹونک کی علمی تاریخ تو اب قصۂ پارینہ بن چکی ہے، لیکن اس کی کچھ یادگاریں اب بھی باقی ہیں اور

وہ اس کے کتب خانے ہیں جو آج بھی اسلاف کے بیش قیمت جواہر پاروں کو اپنے دامن میں لیے بیٹھے ہیں، ان میں سب سے بڑا کتب خانہ سعیدیہ ہے، جو اپنے بیش قیمت نوادر کے اعتبار سے ہندوستان کے ممتاز کتب خانوں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔

اس میں بہت سے قدیم علماء و مصنفین کی کتابوں کے نادر نسخے ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتے، ان میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ صاحب کے تبرکات بھی ہیں، دکن کے قطب شاہی خاندانوں کے نوادر بھی ہیں، مرزا ہمایوں، اکبر اور اورنگ زیب کے مخطوطات بھی ہیں، خود مصنفین کے لکھے ہوئے اور ان کے دستخط شدہ مخطوطات بھی ہیں، خصوصاً چھٹی ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے مشاہیر علماء کے اسناد اور تحریروں کے نہایت نایاب نسخے ہیں۔

اس کتب خانہ کے بانی یمین الدولہ نواب محمد علی خاں ہیں[1] جو نواب امیر الدولہ بہادر بانی ٹونک کے پوتے اور نواب وزیر الدولہ کے جانشین تھے، نواب ممدوح خود بھی بڑے عالم اور علم نواز تھے، نواب صاحب نے سیاسی دنیا سے الگ ایک ادبی دنیا بسائی تھی، جو ابتک قائم ہے، گو سیاسی اعتبار سے، ٹونک ریاست ختم ہو چکی ہے، لیکن نواب محمد علی خاں کی ادبی مملکت آج بھی قائم ہے، نواب محمد علی خاں بہادر ۱۸۶۴ء میں تخت نشین ہوئے اور چار سال بعد ہی انگریزوں نے معزول کر کے بنارس بھیجدیا، یہاں آنے کے بعد نواب صاحب نے ایک ادبی دنیا بسائی، کاتب و خوشنویس اور علماء و فضلاء کو اپنی

---

[1] ہندوستان میں آزادی کا آخری طاقتور شہباز اور پٹھانوں کے سب سے بڑے لیڈر تھے جنھوں نے ٹیپو سلطان کے بعد وطن کو آزاد کرانے کی جد و جہد کی لیکن اپنے ہی ملک کے اغراض پرست ساتھیوں کے عدم تعاون کی بنا پر ناکام ہو کر انگریزوں سے صلح کر لی اور ٹونک کی ریاست لیکر عہد و پیمان میں جکڑ دیے گئے۔ (تاریخ سید احمد شہید مصنف مولانا غلام رسول مہر، ص ۱۱۰)

محفل میں جگہ دی، دور دور سے علمی جواہر پارے جمع کیے، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، مصر و ایران، دنیا کے گوشہ گوشہ سے آدمی بھیجکر نایاب نسخے یا ان کی نقلیں منگائیں، خود بھی تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا، اس طرح جب نواب صاحب نے ۱۸۹۵ء میں انتقال کیا تو ایک بیش بہا کتب خانہ چھوڑ گئے، یہ کتب خانہ نواب صاحب کے فرزند صاحبزادہ عبدالرحیم خانصاحب[1] کو ورثہ میں ملا، جنھوں نے اس کو ٹونک منتقل کر کے اس میں مزید اضافہ کیا، صاحبزادہ عبدالرحیم خانصاحب کے انتقال کے بعد نواب سعادت علی خانصاحب نے اس کو ریاست کو منتقل کر دیا: اور ۱۹۴۷ء میں صاحبزادہ عبدالعظیم خاں کا تقرر ناظم سعیدیہ[2] کتب خانہ کی حیثیت سے کیا، عبدالعظیم خانصاحب نے بڑی جانفشانی اور تندہی سے اس فریضہ کو انجام دیا، اور کتب خانہ کی از سر نو فہرست مرتب کرنے کے لیے ۱۹۵۱ء میں مولانا عمران خاں کو مامور کیا، مولانا موصوف علوم شرقیہ کے صرف فارغ التحصیل ہی نہیں بلکہ اس کے دلدادہ بھی ہیں، اس لیے تین سال کی محنت اور کاوش کے بعد قلمی اور مطبوعہ کتابوں کی الگ الگ فہرستیں باعتبار فن مرتب کیں، انکی بدولت قلمی نسخوں کی ندرت اور خصوصیات کا حال بیان کرنا آسان ہو گیا۔

۱۹۶۱ء میں حکومت راجستھان نے سعیدیہ کتب خانہ کے تمام نوادر کو نئے ادارہ تحقیقات علوم شرقیہ میں منتقل کر دیا، جس میں ناظم ادارہ علوم شرقیہ کی حیثیت سے راقم کام کر رہا ہے۔

---

[1] صاحبزادہ عبدالرحیم خانصاحب نواب محمد علی خاں بہادر کے خلف الصدق تھے، باپ کی طرح خود بھی علم و فن کے شائق اور علوم شرقیہ کے دلدادہ تھے اور اس دنیا میں بڑے عالم کی حیثیت سے مشہور تھے، بہت سی کتابوں کی تالیف و ترتیب بھی کی ہے، اسکے علاوہ موصوف نے مقدس باپ کے اس گرانمایہ ذخیرہ کو اپنی ذاتی کوششوں سے اور زیادہ بڑھایا، یہاں کی ہر کتاب پر موصوف کے حواشی اور دستخط ملتے ہیں۔ [2] نواب سعادت علی خانصاحب بہادر کا تخلص "سعید" تھا، اسی نسبت سے اس کتب خانہ کا نام سعیدیہ پڑا اور خطاب بھی سعید الدولہ تھا۔

یہ کام حکومت نے مولانا آزاد مرحوم کی اسکیم کے تحت کیا ہے، جو ان نوادر کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے حد درجہ لائق ستایش ہے۔

اس ذخیرہ کے بیشتر نوادر پر نواب محمد علی خاں کے قلم کی تحریریں، حواشی اور امیر الدولہ، وزیر الدولہ نوابانِ ٹونک کی مہریں اور دستخط ثبت ہیں، مولانا آزاد اس کتب خانہ کی اہمیت سے پوری طرح واقف تھے، خود بھی استفادہ فرماتے اور دوسروں کو بھی استفادہ کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے، چنانچہ ۱۹۵۱ء میں کتب خانہ سے متعدد کتابیں حکومت راجستھان کے ذریعہ طلب فرمائیں، جو کئی سال تک ان کے زیر مطالعہ رہیں، اسی زمانہ میں آپ نے حکومت راجستھان کو کتب خانہ کی ایک مفصل اور جامع فہرست تیار کرانے کی طرف توجہ دلائی، اور اس کا ایک خاکہ بھی بنا کر بھیجا، اس خاکہ کے مطابق کتابوں کی ایک مکمل فہرست تیار ہوئی جو افسوس ہے کہ اب تک قلمی شکل میں ہے، مگر لائبریری کی دوسری فہرستوں کے مقابلہ میں بہت مفید اور کارآمد ہے۔

اس کتب خانہ کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ملکوں کے فضلا و محققین اس سے استفادہ کے لیے ٹونک آتے ہیں، ۱۹۵۲ء میں عرب لیگ کی جانب سے جو وفد نادر کتابوں کی تلاش اور ان کا فوٹو لینے کے لیے ہندوستان آیا تھا، اس نے اس کتب خانہ کی بیس کتابوں کے فوٹو لیے، اسی طرح کیمبرج یونیورسٹی کے ایک اسکالر نے جو محقق طوسی پر ریسرچ کر رہے تھے، ٹونک آکر اس کتب خانے سے استفادہ کیا، اور ایک کتاب کا عکس حکومت ہند کے ذریعہ منگوایا، ہندوستان کے علماء و مصنفین تو بکثرت آتے رہتے ہیں اور خط و کتابت کے ذریعہ بھی استفادہ کرتے ہیں، جو مشہور شخصیتیں بھی راجستھان آتی ہیں وہ کتب خانہ دیکھنے کے لیے ٹونک ضرور آتی ہیں، خود مولانا آزاد مرحوم کی دلی خواہش تھی کہ کسی موقعہ پر اس گوشۂ خمول میں پڑے ہوئے نایاب ذخیرہ کو ملاحظہ فرمائیں لیکن غیر معمولی مصروفیات کی وجہ سے اس ارادہ کو

پورا نہ کر سکے۔

سعیدیہ لائبریری ٹونک بارہ ہزار سے زائد کتابوں پر مشتمل پورے راجستھان میں علوم شرقیہ کا واحد کتب خانہ ہے، جس میں تین ہزار سے زیادہ قلمی کتابیں ہیں جو مختلف خصوصیات کی حامل ہیں کچھ فنی لحاظ سے نادر ہیں، کچھ ادبی لحاظ سے، بعض ندرت اور قدامت کے لحاظ سے اہم ہیں، بعض کتابت اور صناعی کے لحاظ سے بے نظیر ہیں، اس کتب خانے میں مختلف ملکوں اور مختلف دور کے خطوط اور خطاطی کے نمونے موجود ہیں، جن سے ان کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے، مطلا و مذہب نسخوں کا بھی ایک بیش قیمت ذخیرہ ہے، جو صناعی کا بہترین نمونہ ہیں، اب ان نادر نسخوں کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ قرآن کریم کا ایک مطلّیٰ و مذہب نسخہ جو خطاطی کا بہترین نمونہ ہے۔ کاغذ کی ساخت قلم کی کشش، اس کے بیلدار مذہب حاشیے اور سیاہی کی جاذبیت اس نسخہ کی ندرت اور قدامت کی ضامن ہے، یہ حمائل شریف شیراز میں سنہ ۷۴۴ھ میں لکھا گیا، کاتب کا نام احمد النذیری ہے، کاغذ نہایت نفیس، نایاب اور باریک ہے، پورا نسخہ مع بین السطور اور حاشیہ مطلّیٰ، مذہب ہے۔ نشانات آیات بھی مطلّیٰ ہیں، جدول انتہائی نفیس، رنگین اور دلکش ہے،

۲۔ کلام مجید کا ایک سی ورقہ نسخہ فن خطاطی کے لحاظ سے بے نظیر ہے، پورا کلام مجید تیس اوراق میں ہے، کاغذ بادامی، باریک، شروع کے دو صفحے کا حاشیہ مطلّیٰ اور مینا کار ہے، کل اوراق مجدول طلائی اور بین السطور مطلّا ہیں، حاشیہ حسین بیلدار اور مطلا ہے، خط نہایت باریک ...... لیکن حروف ایسے روشن ہیں کہ دور سے بھی واضح اور دلکش نظر آتے ہیں، خطاطی کی ندرت کے علاوہ ماہر فنکار نے اس رعایت سے کتابت کی ہے کہ ایک ورق میں ایک پارہ ختم ہو جاتا ہے، اور ہر سطر الف سے شروع ہوتی ہے،

۳- کلام مجید کا ایک نسخہ دور مغلیہ کی یادگار ہے، جو تیموری سلاطین کے کتب خانہ میں رہ چکا ہے، لیکن بد قسمتی سے کرم خوردہ اور داغدار ہے۔ اس کی خطاطی، کاغذ کا رنگ، اس کی قدامت کے شاہد ہیں، آخر میں نامکمل ہونے کی وجہ سے خطاط کا اور تاریخ کتابت کا پتہ نہیں چلتا، صرف شروع میں ایک صفحہ پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:

"از کتب خانۂ سرکار مرزا محمد ہمایوں شاہ بہادر ابن مرزا محمد کامبخش عالم بہادر۔"

۴- تقریب النشر- یہ کتاب تجوید و قرأت میں ہے، اور کتب خانے کے بہترین نسخوں میں شمار کیجاتی ہے، محمد بن محمد بن محمد الجزری اس کے مصنف ہیں، اور ان کی زندگی کا مکتوبہ ہے، خود مصنف کے ہاتھ کی ایک قلمی اجازت اس نسخہ پر مرقوم ہے، جو انھوں نے اپنے شاگرد شمس الدین نویری کو عطا کی تھی، محمد الجزری مشرقی دنیا کے جید عالم گذرے ہیں، سلطان بایزید شہنشاہ روم تک آپ کی قدر کرتے تھے، ان کی تحریر نے اس نسخہ کی قدر و قیمت بہت بڑھادی ہے، یہ نایاب نسخہ اورنگزیب عالمگیر کے کتب خانہ کی بھی زینت رہا ہے، کتاب کے دوسرے ورق پر اورنگزیب کی مہر کندہ ہے، تاریخ کتابت ۸۲۹ھ / ۱۴۲۵ء درج ہے، چونکہ مصنف کی قلمی عبارت اس پر مرقوم ہے، اس لیے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مصنف کے عہد کا مکتوبہ ہے،

۵- زاد المسیر (تفسیر) عبدالرحمن ابن جوزی- یہ نسخہ خلفاے عباسیہ کے کتب خانوں کی زینت رہ چکا ہے، ۶۵۶ھ میں جب ہلاکو خاں نے مستعصم باللہ کو قتل کر کے خلافت کا خاتمہ کر دیا اور بغداد کا کتب خانہ برباد ہوا تو یہ نسخہ کسی شخص کے ہاتھ لگ گیا، کتاب کے آخر میں جو عبارت درج ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ۶۵۶ھ میں یہ نسخہ کسی صاحب کے ملک میں آیا، اس کا نام محو شدہ ہے، البتہ سنہ کتابت واضح ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ مصنف ابو الفرج عبدالرحمن بن علی بن جوزی کی زندگی یا اس کے کچھ ہی دن بعد کا لکھا ہوا ہے، اس لیے کہ

مصنف کا انتقال ۵۹۷ھ میں ہوا تھا، نسخہ ہذا کے پہلے صفحہ پر ایک طلائی مزین مربع بنا ہوا ہے، پورا نسخہ بہت دیدہ زیب، محشی، مجدول اور خطاطی و قدیم عربی رسم الخط کا بیش بہا نمونہ ہے، خلفاء کے دور کی عبارتیں جگہ جگہ ہیں جو صاف سمجھنے میں نہیں آتیں،

۶- تفسیر جلالین- سنہ کتابت درج نہیں ہے، لیکن مصنف کی زندگی کا نسخہ ہے، اسی پر خود مولانا جامی کے جگہ جگہ حاشیے ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ مولانا جامی کی زندگی کا ہے، جامی کا انتقال جلال الدین سیوطی سے تیرہ سال قبل ہوا تھا، اس لحاظ سے نسخہ نہایت قابل قدر ہے،[1]

۷- سواطع الالہام فیضی کا یہ بیش بہا نسخہ نہایت خوشخط مطلّی، مذہب اور طلائی مجدول ہے اس نسخہ کے کاتب اور سنہ کتابت کا کچھ پتہ نہیں چل سکا لیکن خطاطی، کاغذ کی ساخت اور قلم کی حسین گلکاریوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ دسویں یا گیارہویں صدی کا مکتوبہ ہے،

۸- تلخیص فی التفسیر- ابو عباس احمد بن یوسف الکواشی ۶۸۰ھ کا قابل دید نسخہ ہے، جو مشہور خطاط عبدالقادر بن صالح بن محمود کے سحرکار اشہب قلم کی گلکاریوں سے مزین ہے یہ نسخہ مصنف کی زندگی کا ہے، اور انہی کے نسخہ سے تصحیح شدہ ہے اور اس پر خود مصنف کے ہاتھ کی ایک تحریر بھی ہے جو اس کا ثبوت ہے کہ یہ نسخہ مصنف کی نظر سے گذر چکا ہے، کتاب کے آخر میں جگہ جگہ "عرض دیدہ شد" مع سنین مرقوم ہے، ان میں سے کوئی نویں صدی سے بعد کا نہیں ہے، کتاب کے صفحہ نمبر ۱۳۰ اور نمبر ۱۴۰ پر مہریں ثبت ہیں، جن میں یہ کندہ ہے،

"جاداں باد نشان خاتم محمود شاہ۔ تا بلوح آسماں باشد منور مہر و ماہ"

۹- الفوز الکبیر، شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی- الفوز الکبیر سے کون واقف نہیں ہے،

---

[1] علامہ جلال الدین سیوطی کا یہی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں ہے، جو ۹۹۴ھ کا مکتوبہ ہے۔
مزید دیکھئے براک ۱۳۵ / ۲ / ۱۷۹ / پٹنہ ۹۵-۲-۱۸

لیکن اس نسخہ کی اس لیے زیادہ اہمیت ہے کہ اس میں خود شاہ صاحب کے قلم سے وہ اجازت درج ہے جو انھوں نے اپنے ایک شاگرد عبد الہادی کو دی تھی، اسی نسخہ سے ان کو درس بھی دیا تھا، جو اس کے مستند ہونے کا ثبوت ہے،

حدیث کے نادر نسخوں کا بھی اس کتب خانے میں معتد بہ ذخیرہ ہے، اس میں سے دو اہم مخطوطات کا ذکر کیا جاتا ہے،

۱۰- اختیار اعتماد المسانید - امام شرف الدین اسمٰعیل بن عیسیٰ[1]، اس مخطوط پر کتاب کا نام نہیں ہے لیکن کشف الظنون نے اختیار اعتماد المسانید لکھا ہے، خود مصنف کے قلم کا مکتوبہ ہے، مصنف نے اس کو ۸۹۰ھ میں مدینہ منورہ میں تالیف کیا، کتاب کے پہلے صفحے پر ایک مربع دو بڑی اور ایک شش پہل مہریں ثبت ہیں، جن کی عبارتیں مٹی ہوئی ہیں۔

۱۱- اشعۃ اللمعات فی شرح مشکوٰۃ شیخ عبد الحق محدث دہلوی، اسکے متعدد قلمی نسخے ہیں، لیکن ایک نسخہ بہت اہم ہے، یہ شیخ کی وفات کے چند ہی سال بعد کا مکتوبہ ہے، انکی وفات ۱۰۵۲ھ میں ہوئی اور اس نسخہ پر ۱۰۷۰ھ سے پہلے کی تحریریں درج ہیں، یہ غوری سلاطین کے کتب خانے میں رہ چکا ہے، اس کے پہلے صفحہ پر ۲۱ مہریں اور آخر کے صفحہ پر ایک مہر ہے، ان مہروں میں ایک مہر شہزادہ اورنگ زیب کی ہے، جو بہت واضح اور نمایاں ہے، ان میں مختلف امیروں کی مہریں بھی ہیں، دو مہریں لطف اللہ خان کی ہیں، وہ شاہجہانی وزیر سعد اللہ خاں کا لڑکا اور خود بڑا صاحب علم تھا، کئی جگہ "عرض دیدہ شد" مرقوم ہے۔

۱۲- کف الرعاع عن محرمات اللہو والسماع ابن حجر ہیثمی المتوفی ۹۷۳ھ

کاتب کا نام درج نہیں، سنہ کتابت ۹۵۸ھ، اس اعتبار سے یہ نسخہ مصنف کی زندگی ہی کا لکھا ہوا ہے، بلکہ بعض تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ خود مصنف کے قلم کا ہے۔ یا کم سے کم

[1] مصنف کے حالات کے لیے دیکھئے الضوء اللامع ج ۳ ص ۳۰۴ - ۳۰۵

مصنف کے لیے لکھا گیا تھا، اس حیثیت سے یہ نسخہ نہایت اہم اور تاریخی ہے

۱۳- منظومۃ النسفی (فقہ) نجم الدین ابوحفص عمر بن محمد المتوفی ۵۳۷ھ، مکتوبہ ۷۸۳ھ قدامت کے علاوہ اس نسخہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ محمود بن محمد بن شمس الدین مراتی بر جلالی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اور اس پر ان کے حواشی ہیں،

۱۴- نقایہ مختصر الوقایہ، عبداللہ بن مسعود محبوبی حنفی المتوفی ۷۴۵ھ مکتوبہ ۹۹۷ھ، شیخ ابوبکر گجراتی کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہایت خوشخط اور مطلّی و مذہب نسخہ ہے، شاہی کتب خانہ میں رہ چکا ہے، کتاب پر اورنگ زیب کی مہر ثبت ہے۔

تصوف کی کتابوں اور بزرگوں کے تذکروں کے بہت سے نسخے ہیں ان میں حسب ذیل نسخے زیادہ اہم ہیں

۱۵- جوامع الکلم - ملفوظات و مواعظ خواجہ گیسو دراز جس کو ان کے مرید خاص خواجہ اکبر حسینی نے مرتب کیا تھا، اس کے نسخے نادر و نایاب ہیں، یہ نسخہ شاہی کتب خانوں میں رہ چکا ہے، اس پر انکی مہریں ثبت ہیں، خواجہ گیسو دراز کی خانقاہ میں جو نسخہ ہے وہ اسی نسخہ کی نقل ہے،

۱۶- نقد النصوص فی شرح الفصوص، مولانا جامی - مصنف کے عہد کا نسخہ ہے، جابجا انکے قلم کے حواشی ہیں، اس لحاظ سے یہ نسخہ نہایت اہم ہے، داراشکوہ کے مطالعہ میں رہ چکا ہے، اس پر اسکی مہر ثبت ہے۔

۱۷- مروج الذہب مسعودی (تاریخ) یہ کتاب بار بار طبع ہو چکی ہے، مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے لیکن یہ قلمی نسخہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ عبد الرحیم خانخاناں کے کتب خانہ میں رہ چکا ہے۔ اور اس پر اس کی تحریر موجود ہے۔

۱۸- تلقیح فہوم الاثرہ فی التاریخ والسیرۃ ابن جوزی، مکتوبہ ۷۷۶ھ، اپنی قدامت کے اعتبار سے اہم ہے، اس کے ساتھ دو اور کتابیں زاد المسیر اور تلقیح بھی ایک جلد میں مجلد ہیں، تلقیح پر سلاطین اور امرا کی مہریں اور تحریریں ثبت ہیں۔

۲۰- فہرست ابن ندیم و وفیات الاعیان، ابن خلکان، مکتوبہ ۱۰۴۳ھ

۳۰- نظم الدرر، المرجان فی سیر سید الانس والجان، مولانا احمد بن مرزا جان ابرکی، قدیم نسخہ ہے، اس کو شاہ ولی اللہ صاحب کے بھائی شاہ اہل اللہ نے ایک مستند نسخے سے نقل کیا تھا،

۳۱- اخلاق محمدی (سیرت) مولانا سید جعفری تیاری، خود مصنف کے قلم کا مکتوبہ ہے، اسکو اورنگزیب کے حضور میں پیش کیا گیا تھا، اس پر مختلف تحویلداروں کی دس مہریں ثبت ہیں، ایک مہر اورنگزیب کی بھی ہے،

۳۲- روضۃ الاحباب فی سیر النبی والاصحاب (فارسی) جلال الدین عطاء اللہ شیرازی، المتوفی ۱۰۰۰ھ، یہ کتاب دو جلدوں میں ہے، قدیم نسخہ ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب کے مطالعہ میں رہ چکا ہے، اس پر ان کے دستخط اور مہر ثبت ہے، اس کا ایک دوسرا نسخہ بھی ہے جس کی ایک جلد سنہ ۱۰۰۰ھ کی اور دوسری ۱۰۷۳ھ کی مکتوبہ ہے، اور اس پر بہت سی مہریں ہیں،

۳۳- سیرت گازرونی (عربی) مولفہ سعید محمد بن مسعود گازرونی، مکتوبہ ۸۲۹ھ، اصل کتاب فارسی میں ہے، اس کا عربی ترجمہ مصنف کے بیٹے ملا عفیف الدین نے کیا تھا،

۳۴- معارج النبوۃ فی مدارج الفتوۃ، مولانا معین الدین ہروی، مکتوبہ ۱۰۶ھ، قدامت کے علاوہ خطاطی کا بھی بہترین نمونہ ہے۔

۳۵- تکملہ صولت فاروقی۔ فتوحات واقدی کو محمد مرزا خاں ترکمانی نے صولت فاروقی کے نام سے فارسی میں نظم کیا تھا، نادر کا انقلاب میں اس کا ایک حصہ ضائع ہو گیا تھا، باقی ماندہ حصہ نواب محمد علی خاں کو ملا، تو انھوں نے متعدد علماء سے اس کی تکمیل کرائی، اس نظم کا نام فتوح الاسلام بھی ہے۔

فارسی تاریخوں خصوصاً اسلامی ہند کی تاریخ کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، اکبر نامہ، جہانگیر نامہ، تزک جہانگیری، امیر نامہ، تیمور نامہ، تاریخ نادری، اور اسی کے ساتھ یہ رکھی ہیں، تاریخ تاج محل، چہار گلشن، خلاصۃ التواریخ، سیر المتاخرین، طبقات اکبر شاہی، شاہجہاں نامہ، بادشاہ نامہ، ظفر نامہ تیموری

عالمگیر نامہ، مرآت آفتاب نامہ، واقعات عالمگیری اور عالم آرائی، عباسی وغیرہ کے قلمی نسخے ہیں، ان میں تاریخ احمدی مصنفہ مولوی سید جعفر علی کا بھی ایک نایاب نسخہ ہے، وہ سید احمد صاحب نجاری نکوی کے مرید تھے، اور حضرت سید احمد شہید بریلوی کے سفر جہاد میں میر منشی تھے، اس نسخے کی صرف جلد اول ہے، دوسرا نسخہ مولانا سید حیدر علی رامپوری ثم ٹونکی نے لکھا، پہلا فارسی زبان میں ہے، اور دوسرا اردو میں، تاریخ احمدی کا ایک حصہ دوم بھی ہے، جو میاں فتح علی کا مرتبہ معلوم ہوتا ہے، اور ۱۲۹۶ھ میں نواب یمین الدولہ محمد علی خاں صاحب بہادر والی ریاست ٹونک کے حکم سے لکھا گیا، یہ بھی اردو میں ہے، اور تاریخ احمدی کا تتمہ معلوم ہوتا ہے، یہ تینوں مخطوطات مولانا آزاد مرحوم نے طلب فرمائے تھے، جن سے مولانا غلام رسول مہر نے بھی استفادہ کیا ہے[1]، تاریخ احمدی ایک مرد مومن کی مجاہدانہ سرگذشت ہے، اس میں خونچکاں کفن کی لالی بھی ہے، اور جہاد فی سبیل اللہ کی سرشاری بھی، سیاسی بحران کی کشاکش بھی ہے اور اس کا علاج بھی، لیکن افسوس کہ یہ گرانقدر سرمایہ اب تک طبع نہیں ہوا ہے، اگر طبع کرا دیا جائے تو دنیا کے سامنے تحریک آزادی کی ایسی تاریخ آجائے گی جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے عجیب و غریب تھی، جس کی یاد آج بھی مسلمانان ہند کے لیے موجب خیر و برکت ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح سید صاحب نے تائید غیبی سے سردار امیر خاں بانی ریاست ٹونک کے لشکر میں خدمات انجام دیں[2]، کیسے ان سے الگ ہوئے اور پھر کس طرح انگریزوں اور سکھوں کے خلاف جہاد شروع کیا، سید صاحب کے جہاد کی پوری تاریخ نگاہ کے سامنے آجاتی ہے،

امیر نامہ ایک روہیلہ پٹھان کی سرگزست اور انگریزوں کے مقابلہ میں اس کی جنگوں اور دلیرانہ مہمات کی داستان ہے، اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں اس پٹھان نے اپنی شجاعت

---

[1] تاریخ سید احمد شہید، غلام رسول مہر، ص ۵ و ۶ [2] ایضاً ص ۸۲

اور دلیری کا سکہ جما لیا تھا، یہ سردار بھی تھا اور امیر بھی، سپاہی بھی تھا اور سالار بھی، تاریخ ہند کا کوئی ایسا طالب علم نہ ہوگا جو امیر خاں کے نام سے واقف نہ ہو، انگریزی مورخین نے تو اس کو ایک جابر اور سفاک پنڈاری لیڈر کی شکل میں دکھایا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ امیر خاں تاریخ ہند کا ایک جانباز سپوت اور مجاہد تھا، ڈاکٹر قانونگو نے لکھا ہے کہ امیر خاں کے ساتھ تاریخ نے انصاف نہیں کیا، وہ ہندوستان کا سب سے آخری بڑا فوجی مدبر[۱] اور آزادیٔ ہند کا سب سے بڑا شہباز تھا[۲]، امیر نامہ اسی مرد مجاہد کی سچی کہانی اور اس کی جنگی روداد ہے۔ جب گورنر جنرل بینٹنگ نے ۱۸۳۲ء میں تمام رؤسائے راجستھان کو اجمیر میں بلایا تو انگریز مترجم پرنسپ کے قول کے مطابق نواب امیر خاں کی بے باکانہ گفتگو اور دلیرانہ طرز تخاطب سے بہت زیادہ متاثر ہوا اور تمام رئیسوں سے زیادہ وقت نواب امیر خاں کے مجاہدانہ قصے سننے میں صرف کیا، پرنسپ کا کہنا ہے کہ امیر نامہ امیر خاں کے حالات کی سچی تصویر ہے، اس لیے کہ امیر خاں نے کبھی شکست کو فتح نہیں بتایا، جہاں فتح ہوئی وہاں فتح لکھی اور جہاں شکست ہوئی بڑی صفائی سے شکست ہی بتائی ہے[۴]۔ ایک انگریز مورخ کے قول کے مطابق امیر نامہ ایک مستند تاریخی کتاب ہے[۵]، جو اب تک غیر مطبوعہ ہے، گو اس کا انگریزی ترجمہ لارڈ بینٹنگ کے حکم کے مطابق ۱۸۳۲ء میں شائع ہو چکا ہے مگر اب نایاب ہے۔

فارسی تواریخ میں دیوان شمس الدین[۶] کے "ہفتہ سالہ امیر و بیست سالہ وزیر" کے نایاب نسخہ

۱؎ دیکھیے Historical Essays by Professor Qanongo. P. 172 ۲؎ تاریخ سید احمد شہیدؒ ص ۸۲

۳؎ امیر خاں نے خود اپنے حالات زندگی لالہ بساون لال شاداں نائب میر منشی سے قلمبند کرائے تھے۔

۴؎ ایضاً ۵؎ Memoirs of Pathan soldier of fortune by Henry Prinsep. P VII

۶؎ دیوان شمس الدین یوں تو ریاست ٹونک کے نامور دیوان تھے لیکن ایک متبحر عالم، مورخ اور محقق بھی تھے، اس ذخیرہ کی ہر کتاب پر موصوف کے حواشی اور دستخط ملتے ہیں، موصوف نے وزیر الدولہ، یمین الدولہ اور امین الدولہ کا زمانہ پایا تھا۔

کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے، جو اب تک غیر مطبوعہ ہے، اس میں امیر خاں بانیٔ ریاست ٹونک اور ان کے جانشین نواب وزیر الدولہ کے سیاسی اور انتظامی حالات بڑے منصفانہ طریقہ سے قلمبند کیے گئے ہیں، امیر خاں پر تحقیق کرنے والے تمام اسکالرس اس سے استفادہ کرتے ہیں، اس لیے اس کا ترجمہ مولوی سعید احمد بی اے اردو میں کر رہے ہیں۔

صرف میں شرح صرف میر مصنفہ مولوی نور محمد بن شیخ فیروز، اس لحاظ سے قابل توجہ ہے کہ خود مصنف کے قلم کی نوشتہ ہے، اس کو مصنف نے اورنگزیب کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لکھا، اس لیے عالمگیر کے نام کا خطبہ بھی اس میں شامل ہے، اس نسخہ پر عالمگیری کتب خانہ کے تحویلدار کی مہر ثبت ہے۔

صرف و نحو کا ایک دوسرے سے تعلق ہے، اس لیے ان کے مخطوطات بھی ایک دوسرے کے قریب ہیں، نحو میں "الاعراب عن قواعد الاعراب" مصنفہ شیخ جمال الدین ابو محمد عبداللہ، خط کوفی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، نسخہ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کسی اصل نسخہ سے نقل کیا گیا ہے، خط کوفی پانچویں صدی ہجری میں متروک ہونے لگا، اس لیے کہ ہروی کی کتاب الابنیہ نوشتہ ۴۴۷ھ ایرانی کوفی میں مرقوم ہے[۱]، لیکن اس نسخہ میں خط کوفی کا اثر بہت نمایاں اور واضح ہے، اور ایسی حسین قلمکاری ہے کہ قلم کی کشش بال سے زیادہ باریک ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے کل نہیں ملتی، اس کے فنی نکات اور خطاطی کے کمال کا صرف دیکھ کر ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے، اسی کے ہمراہ اسی رسم الخط میں ایک اور رسالہ شامل ہے، جس کے نام اور مصنف وغیرہ کا پتہ نہیں چلتا، یہ بھی نحو کی چھوٹی سی کتاب ہے لیکن قدیم اور نادر معلوم ہوتی ہے، اس فن میں حاشیہ سید علی المتوسط سید شریف بھی قابل ذکر ہے، جو ہرات میں ۸۸۱ھ میں لکھا گیا، اور قدیم عربی خط کا بہترین نمونہ ہے، "الفوائد الضیائیہ" شرح کافیہ

۱؎ "قرآن پاک کی ایک قدیم تفسیر" از پروفیسر محمود شیرانی (۱۹۳۲ء)

معروف بہ شرح جامی، مکتوبہ ۱۰۵۰ھ۔ "منہل صافی" فی شرح وافی مکتوبہ ۹۵۰ھ۔ "شرح الفیہ" ابن مالک مصنفہ شمس الدین محمد بن احمد کا نسخہ اس لحاظ سے بہت قابل قدر ہے کہ ۶۹۸ھ کا نوشتہ ہے، یعنی مصنف کی وفات کے کل آٹھ سال بعد اس کے ایک ہم عصر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس سے بھی قدیم نسخہ "الموسومہ قواعد لمطارحہ" ابو محمد جلال الدین حسین بن بدر بن ایاز النحوی (جو نحو کے امام مانے جاتے ہیں) کا ہے، جو ۷۱۱ھ کا نوشتہ ہے، اس پر محمد علی جرجانی کے حواشی بھی ہیں،

لغت کی کتابوں کے بھی بہت سے نایاب نسخے ہیں، ان میں "الغربیین" مکتوبہ ۵۴۲ھ۔ "الدر النثیر" جلال الدین سیوطی ۱۰۶۸ھ[1] کے قبل کا مکتوبہ۔ "شمس العلوم" مصنفہ نشوان بن سعیدی ساتویں یا آٹھویں صدی کا مکتوبہ ہے، نہایت نفیس اور نادر نسخہ ہے، اس کا عکس مصری مصنفین نے کیا تھا۔ شرح نصاب الصبیان مکتوبہ ۹۷۰ھ، فرہنگ جہانگیری فتح المثانی نوشتہ ۱۰۹۲ھ۔ لطایف اللغات مرتبہ مولوی شیخ عبداللطیف، نوشتہ ۱۰۷۷ھ اور "دستور اللغۃ"[2] مکتوبہ ۱۰۱۷ھ بھی قابل دید ہیں،

معانی اور بلاغت کے مخطوطات میں "حاشیہ مطول" ابو القاسم بن ابی بکر سمرقندی اپنی ندرت اور قدامت کے لحاظ سے اہم ہے، گو یہ نسخہ ناقص ہے، بہت سے اوراق مقدم و موخر ہیں لیکن مصنف کے عہد کا نوشتہ ہے، اس لیے کہ کتاب کا سنہ تصنیف ۸۸۰ھ اور یہ نسخہ ۸۹۴ھ

---

[1] چونکہ اس میں ۱۰۶۸ھ تک کی عبارتیں مرقوم ہیں، اس لحاظ سے اس کی کتابت یقیناً سنہ مذکورہ سے پہلے کی ہونی چاہیے، حالانکہ کتاب کی ہیئت اور کاغذ کی ساخت سے بھی یہ اندازہ لگانا بعید از قیاس نہ ہوگا کہ دسویں صدی ہجری کا مکتوبہ ہے۔

[2] کاتب اور مصنف کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔

کا لکھا ہوا ہے۔ اسی کے ہمراہ مطول شرح تلخیص المفتاح علامہ سعید الدین تفتازانی ہے، مکتوبہ ۸۹۰ھ یہ بھی اول الذکر کی طرح نادر ہے۔

شرح دیوان ابو تمام ابو زکریا بن علی تبریزی، خط، کتابت اور قدامت کے اعتبار سے یہ اس قدر اہم ہے کہ مصری وفد نے اس نسخہ کا بھی عکس لیا تھا، تاریخ کتابت کا پتہ نہیں چلتا، لیکن چھٹی صدی یا ساتویں صدی میں اس کا لکھا جانا قیاس کیا جاتا ہے،

فارسی ادبیات کے یوں تو بے شمار مخطوطات ہیں لیکن بوستان سعدی اپنی تذہیب و تزئین کے اعتبار سے اور دیوان آصفی شاہی کتب خانہ میں رہنے کی وجہ سے اہم ہیں، دیوان آصفی کے اول صفحہ پر محمد شاہ بادشاہ کی مہر ثبت ہے، اسکے علاوہ دیوان ثنائی (مطلّیٰ) دیوان اسیر، دیوان زائر اور دیگر دواوین قاسم، واقف، مظہر، ناصر علی سرہندی، صقدر و صائب، عطار وغیرہ کے بھی اچھے قلمی نسخے ہیں، "... ات پدم"[1] اس لحاظ سے بڑی دلچسپ ہے کہ اس میں نرمی دہلوی نے پدمنی کے قصہ کو بڑے دلچسپ اور رومان انگیز میں فارسی زبان میں لکھا ہے، یہ نسخہ شاہی کتب خانہ میں رہ چکا ہے، شرح قصائد خاقانی نوشتہ ۱۰۵۸ھ۔ "صحیفۂ شاہی" از حسین علی کاشفی نوشتہ دسویں صدی ہجری، قصائد کمال خجندی نوشتہ ۱۰۳۷ھ۔ قصائد عرفی نوشتہ جلوس ۲۱ شاہ عالم بادشاہ بھی اچھے نسخے ہیں، قصائد حسن غزنوی کا نسخہ نہایت مذہب و مطلّیٰ اور دیدہ زیب اور شاہجہاں کے عہد زریں کی یادگار ہے، گو کاغذ آب رسیدہ اور بوسیدہ ہو چکا ہے لیکن پورا نسخہ رنگین اور جگہ جگہ مینا کاری اور پچی کاری کی گلکاریاں ہیں، تاریخ کتابت نسخہ کے ناقص ہونے کی وجہ سے نہیں معلوم ہو سکی لیکن اول صفحہ پر ایک جعفر مختار خان جیلنی سہروردی کی ثبت ہے، جو شاہجہانی امراء میں سے تھے، اسی لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ نسخہ شاہجہانی دور سے قبل کا ہے۔

معقولات میں حاشیہ ملا غیاث الدین بر قطبی، نویں صدی کے اواخر یا دسویں صدی کے اوائل کا مکتوبہ ہے، حاشیہ پر کسی صاحب کی تحریر مرقومہ ۹۹۶ھ ہجری لکھی ہوئی ہے، حاشیہ ملا جلال الدین دوانی نوشتہ ۹۹۸ھ

---

[1] عہد جہانگیری کے منصب داروں میں سے تھے جنھوں نے پدماوت کو فارسی میں نظم کیا ہے، اور خطبہ کو جہانگیر کے نام سے معنون کیا ہے۔

بھی نادر ہے، "تحریر القواعد المنطقیہ مشہور بہ قطبی" مکتوبہ ۱۰۰۱ھ، شرح ایساغوجی مشہور بہ "قال اقول"
حسام الدین مکتوبہ ۸۹۹ھ نایاب، نادر اور قابل مطالعہ نسخہ ہے جس پر شاہان اودھ کی متعدد مہریں ہیں۔
ہیئت میں "تشریح الافلاک" ملا عصمت اللہ سہارنپوری، خود مصنف کے قلم کا لکھا ہوا نسخہ
مکتوبہ ۱۰۸۰ھ، طوسی کی "تحریر اقلیدس" مکتوبہ ۷۳۱ھ، اس اعتبار سے یہ نسخہ اور بھی اہم ہے
کہ اس پر تاج الشریعۃ منصور بن محمد کے حواشی ہیں، اس کے علاوہ دو ایک مہریں بھی ثبت ہیں،
پہلی میں "اللہ ولی التوفیق" ۱۰۸۰ھ اور دوسری میں "محمد بن جعفر الشریفی نقش ہے"۔ "فی تحویل
سنی التوالید" ابو معشر جعفر بن محمد المنجم" مکتوبہ ۷۲۰ھ، قدیم عربی رسم الخط کے بہترین نمونے کی حیثیت
سے نایاب اور نادر نسخہ ہے۔ "احکام العوامل" علی شاہ کا نسخہ بھی عمدہ ہے، فن جفر میں "رموز الاسرار"
"رسالہ در جفر" اور دیگر رسائل کے علاوہ ایک رسالہ مرتبہ مولوی عبد المجید خانصاحب[1] ٹونکی، بہترین اور
قابل قدر نسخہ ہے، یہ کل ۸۰ صفحات کا رسالہ ہے لیکن جفر میں حروف کے متعلق اس سے اچھی بحث مشکل ہی سے
ملے گی، اس لیے فنی نقطۂ نظر سے یہ رسالہ قابل قدر ہے۔

طبی کتابوں کے بھی بہت سے قلمی نسخے ہیں، لیکن ان میں "اختیار بدیعی" علی بن حسین انصاری معروف بہ
حاجی عطار، اپنی خطاطی اور تزئین و آرائش کے اعتبار سے بے نظیر نسخہ ہے، پوری کتاب
گلکاری اور مینا کاری کا بہترین نمونہ ہے، جو غالباً کسی شاہی کتب خانہ کی زینت کے لیے بنایا
گیا ہوگا، ۱۰۶۶ھ المطابق ۱۶۵۵ء کا مکتوبہ ہے، بہت حسین اور خوشخط، مطلی اور مذہب،
دو صفحے مطلی، بین السطور، لوح کتاب بہت ہی حسین اور مینا کار ہے، پورا نسخہ طلائی مجدول
اور دیدہ زیب ہے، یہ نسخہ شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے کتب خانہ میں رہ چکا ہے،

[1] موصوف حافظ اور حاجی ہونے کے علاوہ بہترین خوشنویس بھی تھے، انکی متعدد تصانیف ہیں جن میں
ایک اہم تالیف نعل شریف حضرت سید السادات سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی ہے۔

اس کے اوائل جلوس میں شاہی کتب خانہ میں داخل ہوئی، اس کے پہلے صفحہ پر اورنگزیب عالمگیر
کی ایک مہر اور چند عبارتیں ہیں، ایک عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ منعم بیگ خانہ زاد بادشاہ
عالمگیر کی تحویل میں رہی ہے، آخر صفحے پر بھی کئی عبارتیں درج ہیں، لیکن پیوند اور مرمت شدہ
ہونے کی وجہ سے صاف سمجھ میں نہیں آتیں،

اسی فن میں "تقویم الادویہ" محمد بن علی، مکتوبہ ۹۰۱ھ اور "فرح جمالی" ابوبکر۔۔۔۔
نوشتہ ۹۵۵ھ بھی دیدنی ہیں،

یوں تو اس کتب خانے میں ۳۱ فنون میں اور بھی بیسیوں کتابیں ہیں، ان سب کا ذکر
طویل ہوتا، لیکن چند ایسے نادر اور نایاب نسخے ہیں، جن کا تعارف اہل علم کے سامنے ضروری تھا،
اور جو اس کتب خانہ کی زینت ہیں۔